اسلامی عبادات
پر
تحقیقی نظر
ابوالاعلیٰ مودودی
اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ
لاہور — ڈھاکہ — کراچی

اسلامی عبادات

پر

تحقیقی نظر

ابوالاعلیٰ مودودی

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

شاہ عالم مارکیٹ لاہور
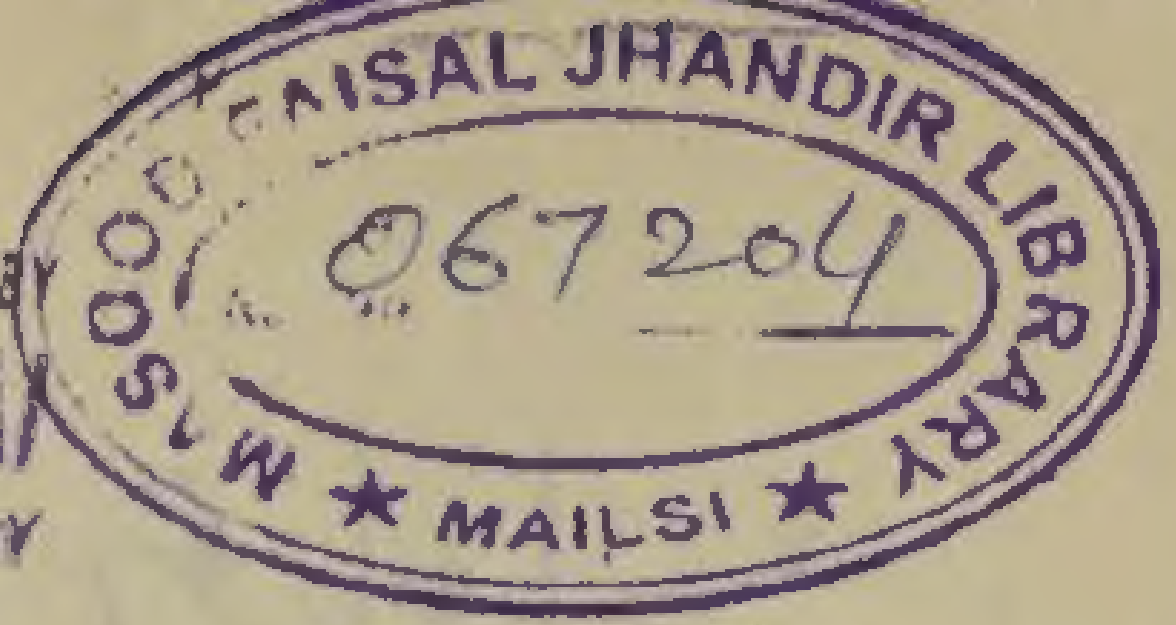
طابع :———— اخلاق حسین ڈائریکٹر ——

ناشر :———— اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ۱۳-ای شاہ عالم مارکیٹ لاہور

مطبع :———— ایور گرین پریس لاہور

قیمت :———— اعلیٰ ایڈیشن - ۲/۲۵ روپے
پلاسٹک کور ۱/۰۰ روپیہ سستا ایڈیشن - ۱/۶۰ روپیہ

بار چہارم :———— ۱۹۵ء ———— ۱۱۰۰

بار پنجم :———— مئی ۱۹۵۸ء ———— ۱۱۰۰

بار ششم :———— جون ۱۹۶۳ء ———— ۲۰۰۰

بار ہفتم ———— جولائی ۱۹۶۷ء ———— ۲۰۰۰

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

دیباچہ طبع اوّل

جس موضوع پر اس رسالہ میں بحث کی گئی ہے، اس پر اس سے پہلے میں اپنے "خطبات" میں روشنی ڈال چکا ہوں، لیکن وہاں میرے مخاطب عوام تھے جو زیادہ گہرے معانی کا ادراک نہیں کر سکتے اس لیے مجھے بہت سادہ مطالب تک گفتگو محدود رکھنی پڑتی تھی۔ اس کے بعد میں نے ضرورت محسوس کی کہ تعلیم یافتہ اور صاحبِ فکر و نظر اصحاب کے لیے اسی موضوع پر ایک مستقل مقالہ لکھوں تاکہ عبادات کی نسبت زیادہ عمیق معانی ان کے سامنے پیش کیے جائیں۔ اگرچہ ابھی اس میں بہت کچھ اضافہ کی گنجائش ہے اور تمام ان حقیقتوں کا اس میں اضافہ نہیں کیا گیا ہے جو عبادات میں پوشیدہ ہیں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ جو کچھ اس میں عرض کیا گیا ہے وہ اکثر اہلِ علم کے عقلی اطمینان کے لیے کافی ہوگا ——————

سردست صرف نماز روزہ کے متعلق میرے دو مقالے شائع کیے جا رہے ہیں۔ ابھی زکوٰۃ اور حج پر گفتگو باقی ہے، لیکن اس کےلیے فرصت کا انتظار ہے اور احباب کا تقاضا ہے کہ جو کچھ لکھا جا چکا ہے آ سکے، جو کچھ لکھا جانا ہے اس کے انتظار میں روک نہ رکھا جائے۔ اس لیے یہ صفحات اس رسالے کے حصہ اوّل کی حیثیت سے نذرِ ناظرین ہیں ——————

—— ابوالاعلیٰ

عرضِ ناشر

اس کتاب کا یہ ساتواں ایڈیشن پیشِ خدمت ہے۔ ہم نے اپنی روایات کے مطابق اس کتاب کے ظاہری حسن کو اس کے معنوی حسن سے ہم آہنگ کرنے کے لئے آفسٹ کی دیدہ زیب کتابت و طباعت کو اختیار کیا ہے۔

اس ایڈیشن میں اس بات کا بھی اہتمام کیا گیا ہے کہ ان آیات و احادیث کے حوالے بھی دیئے گئے ہیں جو سابقہ ایڈیشنوں میں موجود نہ تھے، نیز ان کا مستند ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔ اس طرح اس کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ ہو چکا ہے۔

جو حضرات اس کتاب سے مکمل استفادہ کرنا چاہتے ہیں اور اسلام کی دوسری عبادات، زکوٰۃ، حج اور جہاد کے متعلق بھی معلومات حاصل کرنی چاہتے ہیں انھیں اس کے ساتھ مولانا موصوف کی دوسری تالیف "خطبات" کا بھی مطالعہ کرنا چاہیئے۔

نیاز مند

اخلاق حسین

[illegible] ڈائریکٹر

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور

لاہور

۲۳ ربیع الثانی ۱۳۸۷ھ

مطابق یکم اگست ۱۹۶۷ء

حقیقتِ عبادت

قرآن کی رو سے عبادت وہ اصل مقصد ہے جس کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ۔[1] "میں نے نہیں پیدا کیا جن و انس کو مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں" انبیا علیہم السلام جس غرض کے لیے دُنیا میں بھیجے گئے وہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ انسان کو خُدا کی عبادت کی طرف دعوت دیں۔ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ۔[2] پس ہمارے لیے یہ جاننا نہایت ضروری ہے کہ عبادت سے مراد کیا ہے۔ اور اسلام میں جو عبادات ہم پر فرض کی گئی ہیں ان کی اصلی روح کیا ہے۔ اگر ان امور کو ہم نہ جانیں گے تو اس مقصد ہی کو پورا کرنے میں قاصر رہ جائیں گے۔ جس کے لیے ہم کو پیدا کیا گیا ہے۔

عبادات کا جاہلی تصوّر | اسلام میں عبادات کا مفہوم محض پوجا کا نہیں ہے، بلکہ بندگی (Prayer) کا بھی ہے۔ عبادات کو محض پوجا کے معنی میں لینا دراصل جاہلیت کا تصوّر ہے۔ جاہل لوگ اپنے معبودوں کو انسانوں

---

[1] الذاریات۔ ۵۶)

[2] یہ کہ بندگی کرو اللہ کی اور دور رہو طاغوت سے (النحل۔ ۳۶)

پر قیاس کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح بڑے آدمی، سردار یا بادشاہ، خوشامد سے خوش ہوتے ہیں، نذرانے پیش کرنے سے مہربان ہو جاتے ہیں، ذلّت اور عاجزی کے ساتھ ہاتھ جوڑنے سے پسیج جاتے ہیں اور ان سے یُونہی کام نکالا جا سکتا ہے، اسی طرح ان کا معبود بھی انسان سے خوشامد، نذر و نیاز اور اظہارِ عاجزی کا طالب ہے۔ انہی تدبیروں سے اس کو اپنے حال پر مہربان کیا جا سکتا ہے اور اس کو خوش کر کے کام نکالا جا سکتا ہے۔ اس تصور کی بنا پر جاہلی مذاہب چند مخصوص اوقات میں مخصوص مراسم ادا کرنے کو عبادت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

عبادت کا جوگیانہ تصوّر اسی طرح اسلام میں عبادت کا یہ بھی تصور نہیں ہے کہ آدمی دُنیا کی زندگی سے الگ ہو کر خُدا سے لَو لگائے، مراقبہ (Meditation) نفس کشی اور مجاہدات و ریاضات (Spiritual Exercises) کے ذریعہ سے اپنی اندرونی قوتوں کو نشوونما دے، کشف و کرامت کی قوتیں اپنے اندر پیدا کرے، اور دنیوی زندگی کی ذمہ داریوں سے سبکدوشی حاصل کر کے آخروی نجات حاصل کرے۔ عبادت کا یہ تصور اُن مذاہب میں پایا جاتا ہے جن کی بنیاد زندگی کے راہبانہ تصور (Ascetic View of Life) پر ہے، جو اس دُنیا کو انسان کے لیے قیدخانہ اور جسم کو روح کے لیے قفس سمجھتے ہیں، جن کے نزدیک دینداری اور دنیا داری ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ جو دُنیا کی زندگی اور اس کی ذمہ داریوں اور اس کے تعلقات سے باہر نجات کا راستہ ڈھونڈتے ہیں۔ جن کے نزدیک روحانی ترقی کے لیے

مادّی انحطاط یا مادّیات سے بے تعلقی ناگزیر ہے۔

عبادت کا اسلامی تصور

اسلام کا تصور ان دونوں سے مختلف ہے۔ اسلام کی نگاہ میں انسان خدائے واحد کا بندہ ہے۔ اس کا خالق، اس کا رازق، اس کا مالک، اس کا حاکم صرف خداوند عالم ہے۔ خدا نے اس زمین پر اس کو اپنے خلیفہ کی حیثیت سے مامور کیا ہے۔ یہاں کچھ اختیارات اس کو عطا کیے ہیں۔ کچھ ذمہ داریاں اور کچھ خدمتیں اس کے سپرد کی ہیں۔ اپنی مملکت اور اپنی رعیّت کے ایک حصّہ پر اس کو کچھ اقتدار دیا ہے۔ اس کا کام یہاں اپنے مالک کے مقصد کو پورا کرنا ہے۔ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنا اور ادا کرنا ہے۔ آقا کی سپرد کی ہوئی خدمتوں کو انجام دینا ہے۔ اپنے اختیارات کو اور اپنی قوتوں کو حاکمِ اصلی کے قانون اور اس کی رضا کے مطابق استعمال کرنا ہے۔ جس قدر زیادہ سرگرمی و جانفشانی کے ساتھ وہ زمین کی زندگی میں اپنی ذمہ داریوں اور اپنی متعلقہ خدمات کو بجا لائے گا، اور جتنی زیادہ وفاداری اور فرماں برداری کے ساتھ اپنے اختیارات کے استعمال میں مالک کے قانون کی پیروی کرے گا، اتنا ہی زیادہ وہ کامیاب ہوگا۔ اس کی آئندہ ترقی کا انحصار اسی پر ہے کہ اپنی ماموریت کی مدّت ختم کرنے کے بعد جب وہ مالک کے سامنے حساب کے لیے پیش ہو تو اس کے کارنامۂ زندگی سے یہ ثابت ہو کہ وہ ایک فرض شناس اور مطیع و فرماں بردار بندہ تھا، نہ یہ کہ سست، کام چور، نافرض شناس تھا، یا یہ کہ باغی و نافرمان تھا۔

اس نقطۂ نظر سے عبادت کے وہ دونوں تصور جو ابتداء میں بیان کیے گئے

ہیں غلط اور قطعی غلط ہیں۔ جو شخص اپنے اوقات میں سے تھوڑا سا وقت خدا کو پوجنے کے لیے الگ کرتا ہے اور اس تھوڑے سے وقت میں عبادت کے چند مخصوص مراسم ادا کر دینے کے بعد یہ سمجھتا ہے کہ میں نے خدا کا حق ادا کر دیا ہے، اب میں آزاد ہوں کہ اپنی زندگی کے معاملات کو جس طرح چاہوں انجام دوں، اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی ملازم جسے آپ نے رات دن کے لیے نوکر رکھا ہو، اور جسے پوری تنخواہ دے کر آپ پرورش کر رہے ہوں، وہ بس صبح و شام آکر آپ کو جھک جھک کر سلام کر دیا کرے، اور اس کے بعد آزادی کے ساتھ جہاں چاہے کھیلتا پھرے یا جس جس کی چاہے نوکری بجا لائے۔ اسی طرح جو شخص دنیا اور اس کے معاملات سے الگ ہو کر ایک گوشے میں جا بیٹھتا ہے اور اپنا سارا وقت نماز پڑھنے، روزے رکھنے، قرآن پڑھنے اور تسبیح پھرانے میں صرف کر دیتا ہے، اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جسے آپ اپنے باغ کی رکھوالی کے لیے مقرر کریں۔ مگر وہ باغ کو اور اس کے کام کاج کو چھوڑ کر آپ کے سامنے ہر وقت ہاتھ باندھے کھڑا رہے، صبح سے شام اور شام سے صبح تک آقا آقا پکارتا رہے، اور باغبانی کے متعلق جو ہدایات آپ نے اسے دی ہیں ان کو نہایت خوش الحانی اور ترتیل کے ساتھ بس پڑھتا ہی رہے، ان کے مطابق باغ کی اصلاح و ترقی کے لیے کام ذرا نہ کر کے دے۔ ایسے ملازموں کے متعلق جو کچھ رائے آپ قائم کریں گے وہی رائے اسلام کی بھی ایسے عبادت گزاروں کے متعلق ہے۔ اور جو برتاؤ اس قسم کے ملازموں کے ساتھ آپ کریں گے، وہی برتاؤ ان غلط

تصورات کے تحت عبادت کرنے والوں کے ساتھ خدا بھی کرے گا۔

سلام کا تصورِ عبادت یہ ہے کہ آپ کی ساری زندگی خدا کی بندگی میں بسر ہو۔ آپ اپنے آپ کو دائمی اور ہمہ وقتی ملازم (Whole Time Servant) سمجھیں۔ آپ کی زندگی کا ایک لمحہ بھی خدا کی عبادت سے خالی نہ ہو۔ اس دُنیا میں آپ جو کچھ بھی کریں۔ خدا کی شریعت کے مطابق کریں۔ آپ کا سونا اور جاگنا۔ آپ کا کھانا اور پینا، آپ کا چلنا اور پھرنا، غرض سب کچھ خدا کے قانونِ شرعی[1] کی پابندی میں ہو۔ خدا نے جن تعلقات میں آپ کو باندھا

[1] موجودہ زمانے میں ایک صاحب نے قانونِ شرعی (Moral Law) اور قانونِ طبیعی (Physical Law) کے فرق کو نظر انداز کرکے گمراہیوں کا ایک عظیم الشان نقشہ کھڑا کر دیا ہے۔ ان کے نزدیک عبادتِ الٰہی محض قانونِ طبیعی کی پیروی کا نام ہے، قطع نظر اس کے کہ قانونِ شرعی کے مطابق ہو یا نہ ہو۔ بنا بریں وہ ان لوگوں کو بھی خدا کا عبادت گذار اور خلیفۃ الٰہی اور صالح و مومن قرار دیتے ہیں جو قانونِ طبیعی کے ماتحت تنظیم اور سائنٹیفک ایجادات کے ذریعہ سے طاقت بہم پہنچائیں، اگرچہ اس طاقت سے کام لینے میں خدا کے قانونِ شرعی کے پابند نہ ہوں۔ یہ ایسی زبردست غلطی ہے جس نے کفر کو عین اسلام، بغاوت کو عین عبادت اور معصیت کو عین طاعت بنا کر رکھ دیا ہے۔ اور اسلام کے مشن کی اصلی روح ہی کو مسخ کر ڈالا ہے۔ ان صاحب کو یہ معلوم نہیں کہ اسلام کے آنے کا تو بنیادی مقصد ہی یہ ہے کہ آدمی کو قانونِ طبیعی سے قانونِ شرعی کے تحت کام لینے کی تعلیم دے۔ اگر انسان محض قانونِ طبیعی کے تحت عمل کرنے کے لیے ہوتا تو اس چیز کی تعلیم دینے کے لیے کسی نبی اور کتاب کے آنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس

(بقیہ صفحہ پر)

ہے۔ ان سب میں آپ بندھیں، اور ان کو اس طریقے سے جوڑیں یا توڑیں جس طریقے سے خدا نے انہیں جوڑنے یا توڑنے کا حکم دیا ہے۔ خدا نے جو خدمات آپ کے سپرد کی ہیں اور دنیوی زندگی میں جو فرائض آپ سے متعلق کیے ہیں، ان سب کا بار آپ نفس کی پوری رضامندی کے ساتھ سنبھالیں اور ان کو اس طریقے سے ادا کریں جس کی طرف خدا نے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے آپ کی رہنمائی کی ہے۔ آپ ہر وقت ہر کام میں خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں، اور سمجھیں کہ آپ کو اپنی ایک ایک حرکت کا حساب دینا ہے۔ اپنے گھر میں بیوی بچوں کے ساتھ، اپنے محلّہ میں ہمسایوں کے ساتھ، اپنی سوسائٹی میں دوستوں کے ساتھ اور اپنے کاروبار میں اہلِ معاملہ کے ساتھ برتاؤ کرتے وقت ایک ایک بات اور ایک ایک کام میں خدا کی مقرر کردہ حدود کا آپ

(بقیہ صفحہ گذشتہ) کے لیے نوجوانی جبلّت ہی کافی تھی۔ اگر آدمی کا کام محض قانونِ طبیعی پر عمل کرنا ہی ہو تو اس میں اور جانور میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ جس طرح بھیڑیا بکری کو پھاڑ کھاتا ہے۔ اور یہ اس کے لیے قانونِ طبیعی ہے۔ اسی طرح ایک آدمی اگر دوسرے آدمی سے زیادہ طاقت رکھتا ہے اور اس کو پھاڑ کھاتا ہے، تو یہ اس کے لیے بھی قانونِ طبیعی ہے۔ ایک قوم اگر دوسری قوم سے زیادہ ہوائی جہاز اور بم بنا سکتی ہے اور اس طاقت سے کام لے کر اسے اپنا بندہ بنا لیتی ہے تو یہ بھی اس کے لیے قانونِ طبیعی ہے۔ یہ نظریہ انسان کو انسانیت کے درجہ سے گرا کر درندوں اور موذی جانوروں کے مرتبہ میں پہنچا دیتا ہے۔ اور اسلام اس سے ہزاروں کوس دور ہے کہ انسان کی اس حیوانیت کو خدا کی عبادت قرار دے۔

کو خیال رہے۔ جب آپ رات کے اندھیرے میں ہوں اور کوئی نافرمانی اس طرح کر سکتے ہوں کہ کوئی آپ کو دیکھنے والا نہ ہو، اس وقت بھی آپ کو یہ خیال رہے کہ خدا آپ کو دیکھ رہا ہے۔ جب آپ جنگل میں جا رہے ہوں اور وہاں کوئی جرم اس طرح کر سکتے ہوں کہ کسی پکڑنے والے اور کسی گواہی دینے والے کا کھٹکا نہ ہو، اس وقت بھی آپ خدا کو یاد کر کے ڈر جائیں اور جرم سے باز رہیں۔ جب آپ جھوٹ، بے ایمانی اور ظلم سے بہت سا فائدہ حاصل کر سکتے ہوں اور کوئی آپ کو روکنے والا نہ ہو، اس وقت بھی آپ خدا سے ڈریں اور فائدے کو اس لیے چھوڑ دیں کہ خدا اس سے ناراض ہوگا۔ اور جب سچائی اور ایمانداری میں سراسر آپ کو نقصان پہنچتا ہو اس وقت بھی نقصان اٹھانا قبول کریں، صرف اس لیے کہ خدا اس سے خوش ہوگا۔

پس دُنیا کو چھوڑ کر کونوں اور گوشوں میں جا بیٹھنا اور اللہ اللہ کرنا عبادت نہیں ہے۔ بلکہ دُنیا کے دھندوں میں پھنس کر اور دینوی زندگی کی ساری ذمہ داریوں کو سنبھال کر خدا کے قانون کی پابندی کرنا عبادت ہے۔ ذکرِ الٰہی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ زبان پر اللہ اللہ جاری ہو، بلکہ اصلی ذکرِ الٰہی یہ ہے کہ جو چیزیں خدا سے غافل کرنے والی ہیں ان میں پھنسو اور پھر خدا سے غافل نہ ہو۔ دُنیا کی زندگی میں جہاں قانونِ الٰہی کو توڑنے کے بے شمار مواقع، بڑے بڑے نقصانوں کا خوف لیے ہوئے سامنے آتے ہیں، وہاں خدا کو یاد کرو اور اس کے قانون کی پیروی پر قائم رہو۔ حکومت کی کرسی پر بیٹھو اور وہاں یاد رکھو کہ میں بندوں کا خدا نہیں ہوں بلکہ خدا کا بندہ ہوں۔ عدالت کے منصب

پر متمکن ہو اور وہاں ظلم پر قادر ہونے کے باوجود خیال رکھو کہ خُدا کی طرف سے میں عدل قائم کرنے پر مامور ہوں زمین کے خزانوں پر قابض و متصرف ہو اور پھر یاد رکھو کہ میں ان خزانوں کا مالک نہیں ہوں بلکہ امین ہوں اور پائی پائی کا حساب مجھے اصل مالک کو دینا ہے۔ فوجوں کے کمانڈر بنو اور پھر خوفِ خُدا تمہیں طاقت کے نشے میں مدہوش ہونے سے بچاتا رہے۔ سیاست و جہاں بانی کا کٹھن کام ہاتھ میں لو اور پھر سچائی، انصاف اور حق پسندی کے مستقل اصولوں پر عمل کر کے دکھاؤ۔ تجارت اور مالیات اور صنعت کی باگیں سنبھالو اور پھر کامیابی کے ذرائع میں پاک اور ناپاک کا امتیاز کرتے ہوئے چلو۔ ایک ایک قدم پر حرام تمہارے سامنے ہزار خوشنمائیوں کے ساتھ آئے اور پھر تمہاری رفتار میں لغزش نہ آنے پائے۔ ہر طرف ظلم اور جھوٹ اور دغا اور فریب اور بدکاری کے راستے تمہارے سامنے کھلے ہوئے ہوں اور دنیوی کامیابیاں اور مادی لذّتیں ہر راستے کے سرے پر جگمگاتے ہوئے تاج پہنے کھڑی نظر آئیں اور پھر خدا کی یاد اور آخرت کی بازپرس کا خوف تمہارے لیے پابہ پا بن جائے۔ حدود اللہ میں سے ایک ایک حد قائم کرنے میں ہزاروں مشکلیں دکھائی دیں، حق کا دامن تھامنے اور عدل و صداقت پر قائم رہنے میں جان و مال کا زیاں نظر آئے۔ اور خدا کے قانون کی پیروی کر زمین و آسمان کو دشمن بنا لینے کا ہم معنی ہو جائے، پھر بھی تمہارا ارادہ متزلزل نہ ہو اور تمہاری جبیں عزم پر شکن تک نہ آئے۔ یہ ہے اصلی عبادت۔ اس کا

نام ہے یادِ خدا۔ اسی کو ذکرِ الٰہی کہتے ہیں، اور یہی وہ ذکر ہے جس کی طرف قرآن میں اشارہ فرمایا گیا ہے کہ فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ۔[1]

روحانی ارتقاء اور خدا کی یافت کا راستہ

اسلام نے روحانی ترقی اور خدا کی یافت کا بھی یہی راستہ بتایا ہے۔ انسان خدا کو جنگلوں اور پہاڑوں میں یا عزلت کے گوشوں میں نہیں پا سکتا۔ خدا اس کو انسانوں کے درمیان، دنیوی زندگی کے ہنگامۂ کارزار میں ملے گا اور اس قدر قریب ملے گا کہ گویا وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ جس کے سامنے حرام کے فائدے، ظلم کے مواقع اور بدکاری کے راستے قدم قدم پر آئے اور ہر قدم پر وہ خدا سے ڈر کر ان سے بچتا ہوا چلا، اسے خدا کی یافت ہو گئی۔ ہر قدم پر وہ اپنے خدا کو پاتا رہا، بلکہ آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ نہ پاتا اور نہ دیکھتا تو اس دشوار گھاٹی سے بخیریت کیونکر گزر سکتا تھا؟ جس نے گھر میں تفریح کے لمحوں میں، اور کاروبار کے ہنگاموں میں ہر کام اس احساس کے ساتھ کیا کہ خدا مجھ سے دور نہیں ہے، اُس نے خدا کو ہر لمحہ اپنے سے قریب اور بہت قریب پایا۔ جس نے سیاست اور حکومت اور صلح و جنگ اور مالیات اور صنعت و تجارت جیسے ایمان کی سخت آزمائش کرنے والے کام کیے اور یہاں کامیابی کے شیطانی ذرائع سے بچ

[1] پس جب نماز ختم ہو جائے تو پھیل جاؤ زمین میں اور تلاش کرو اللہ کے فضل میں سے اور یاد کرو اللہ کو بہت تاکہ تم فلاح پاؤ (الجمعہ)

کر خُدا کے مقرر کیے ہوئے حدود کا پابند رہا اس سے بڑھ کر مضبوط اور سچّا ایمان اور کس کا ہو سکتا ہے؟ اُس سے زیادہ خُدا کی معرفت اور کسے حاصل ہو سکتی ہے؟ اگر وہ خُدا کا ولی اور مقرب بندہ نہ ہوگا تو اور کون ہوگا؟

اسلامی نقطۂ نظر سے انسان کی روحانی قوتوں کے نشو و نما کا راستہ یہی ہے۔ روحانی ارتقاء اس کا نام نہیں ہے کہ آپ پہلوان کی طرح ورزشیں کرکے اپنی قوت ارادی (Will Power) کو بڑھا لیں اور اس کے زور سے کشف وکرامت کے شعبدے دکھانے لگیں۔ بلکہ روحانی ارتقا اس کا نام ہے کہ آپ اپنے نفس کی خواہشات پر قابو پائیں، اپنے ذہن اور اپنے جسم کی تمام طاقتوں سے صحیح کام لیں، اپنے اخلاق میں خُدا کے اخلاق سے قریب تر ہونے کی کوشش کریں۔ دنیوی زندگی میں جہاں قدم قدم پر آزمائش کے مواقع پیش آتے ہیں، اگر آپ حیوانی اور شیطانی طریقِ کار سے بچتے ہوئے چلیں اور پورے شعور اور صحیح تمیز کے ساتھ اس طریقے پر ثابت قدم رہیں جو انسان کے شایانِ شان ہے، تو آپ کی انسانیت یوماً فیوماً ترقی کرتی چلی جائے گی۔ اور آپ روز بروز خُدا سے قریب تر ہوتے جائیں گے۔ اس کے سوا روحانی ترقی اور کسی چیز کا نام نہیں ہے[1]۔

---

[1] اکثر لوگ "روحانی ترقی" کا لفظ بولتے ہیں، مگر خود نہیں جانتے کہ "روحانیت" آخر ہے کیا چیز۔ اسی لیے وہ تمام عمر ایک مبہم چیز کی تلاش اور سعی وحصول میں لگے رہتے ہیں اور ساری تگ و دو کے بعد بھی کچھ نہیں جانتے کہ کہاں پہنچنا تھا اور کہاں

(باقی صفحہ پر)

اسلام میں مراسمِ عبادت کی حیثیت کیا ہے؟

یہ خلاصہ ہے اسلامی تصورِ عبادت کا۔ اسلام انسان کی پوری دنیوی زندگی کو عبادت میں تبدیل کر دینا چاہتا ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ آدمی کی زندگی کا کوئی لمحہ بھی خدا کی عبادت سے خالی نہ ہو۔ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کرنے کے ساتھ ہی یہ بات لازم آ جاتی ہے کہ جس اللہ کو آدمی نے اپنا معبود تسلیم کیا ہے، اس کا عبد یعنی بندہ بن کر رہے، اور بندہ بن کر رہنے ہی کا نام عبادت ہے۔ کہنے کو تو یہ چھوٹی سی بات ہے اور بڑی آسانی کے ساتھ اسے زبان سے ادا کر دیا جا سکتا ہے، مگر عملاً آدمی کی ساری زندگی کا اپنے تمام گوشوں کے ساتھ عبادت بن جانا آسان کام نہیں، اس کے لیے بڑی زبردست ٹریننگ کی ضرورت ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ خاص طور پر ذہن کی تربیت کی جائے، مضبوط کیرکٹر پیدا کیا جائے، عادات اور خصائل کو ایک سانچے میں ڈھالا جائے اور صرف انفرادی سیرت ہی کی تعمیر پر اکتفا نہ کیا جائے۔ بلکہ

(بقیہ صفحہ گذشتہ) بیٹھے۔ حالانکہ اگر اسی لفظ "روحانیت" پر غور کریں تو بات بالکل واضح ہو جائے کہ اس لفظ روحانیت میں روح سے مراد انسانی روح ہے نہ کہ [illegible]۔ پس روحانیت انسانیت ہی کا دوسرا نام [illegible] انسان جتنا [illegible] کی بندگی سے نکل کر کمالِ انسانیت کی طرف جتنی زیادہ پیش قدمی کرے گا اور [illegible] اوصافِ انسانی سے آراستہ ہو کر خلافتِ الٰہی کے بلند ترین منصب [illegible] جتنی کامیابی حاصل کرے گا، [illegible] روحانیت حاصل ہوگی۔

اجتماعی نظام قائم کیا جائے جو بڑے پیمانہ پر افراد کو اس عبادت کے لیے تیار کرنے والا ہو، اور جس میں جماعت کی طاقت فرد کی پشت پناہ، اس کی مددگار اور اس کی کمزوریوں کی تلافی کرنے والی ہو۔ یہی غرض ہے جس کے لیے اسلام میں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی عبادتیں فرض کی گئی ہیں۔ ان کو عبادت کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بس یہی عبادت ہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اُس اصل عبادت کے لیے آدمی کو تیار کرتی ہیں۔ یہ اس کے لیے لازمی ٹریننگ کورس ہیں۔ انہی سے وہ مخصوص ذہنیت بنتی ہے، اس خاص کیرکٹر کی تشکیل ہوتی ہے، منظم عادات و خصائل کا وہ پختہ سانچہ بنتا ہے اور اس اجتماعی نظام کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں جس کے بغیر انسان کی زندگی کسی طرح عبادتِ الٰہی میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔ ان چار چیزوں کے سوا اور کوئی ذریعہ ایسا نہیں ہے جس سے یہ مقصد حاصل ہو سکے۔ اسی بنا پر ان کو ارکانِ[1] اسلام قرار دیا گیا ہے۔ یعنی یہ وہ ستون ہیں جن پر اسلامی

---

[1] انہی صاحب نے جن کا ذکر اس سے پہلے حاشیہ میں کیا جا چکا ہے، کلمۂ شہادت اور ان چار عبادتوں کے ارکانِ اسلام ہونے کا صاف انکار کر دیا ہے اور اس کے بجائے اپنی طرف سے اسلام کے دس ارکان تصنیف کیے ہیں۔ یہ صاحب بری طرح جہل مرکب میں مبتلا ہیں۔ ان کو نہ اسلام سے کوئی واقفیت ہے۔ نہ لفظ رکن کے معنی و مفہوم کو وہ جانتے ہیں۔ نہ انہیں یہ خبر ہے کہ یہ پانچوں چیزیں کس حیثیت سے اسلام کی رکن قرار دی گئی ہیں۔ نہ وہ اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ اگر یہ پانچوں چیزیں موجود نہ ہوں تو اسلام سرے سے کسی چیز کا نام ہی نہیں رہتا۔ اس پر مزید ستم ظریفی یہ ہے کہ خدا کے پیغمبر نے جن چیزوں

(باقی ص ۹ پر)

زندگی کی عمارت قائم ہوتی اور قائم رہتی ہے۔

آیئے، اب ہم دیکھیں کہ ان میں سے ایک ایک رکن اسلامی زندگی کی عمارت کو کس طرح قائم کرتا ہے۔ اور کس طرح انسان کو اس بڑی عبادت کے لیے تیار کرتا ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

(بقیہ صفحۂ گذشتہ) کو ارکان اسلام قرار دیا ہے ان کو یہ حضرت فرماتے ہیں کہ یہ ارکانِ اسلام نہیں ہیں۔ اور خود انھوں نے جن دس باتوں کو تصنیف کیا ہے انہیں یہ ارکانِ اسلام قرار دیتے ہیں۔ گویا آنجناب کے نزدیک اسلام اس دین کا نام نہیں ہے جسے خدا کے رسولؐ نے پیش کیا تھا، بلکہ جس چیز کو یہ کیمبرج کا رنگلر وضع کرے گا اس کا نام اسلام ہے۔ ایک طرف ان بزرگ کے یہ تخیلات ہیں اور دوسری طرف عام لوگوں میں علم کی کمی اور دُنیا پرستی کی زیادتی کا یہ حال ہے کہ ایسے شخص کی قیادت میں جو تنظیم ہو اسے وہ اسلامی تنظیم اور اسلامی نظامِ امارت سمجھتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک امیر کے عقیدہ اور علمِ دین اور اخلاق کو دیکھنے کی حاجت نہیں۔ نفس تنظیم اور نفسِ نظامِ امارت مقصود بالذات ہے، خواہ عمر فاروقؓ کے تحت ہو، خواہ ہٹلر اور مسولینی کے تحت میسر آجائے۔ خدا کی پناہ اس دور کے فتنے کس حد تک پہنچ رہے ہیں۔

نماز

یاد دہانی انسان کی زندگی کو عبادت میں تبدیل کرنے کے لیے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ اس کے ذہن میں اس بات کا شعور ہر وقت تازہ، ہر وقت زندہ اور ہر وقت کار فرما رہے کہ وہ خُدا کا بندہ ہے۔ اور اُسے دُنیا میں سب کچھ بندہ ہونے کی حیثیت ہی سے کرنا ہے۔ اس شعور کو بار بار ابھارنے اور تازہ کرنے کی ضرورت اس لیے لاحق ہوتی ہے کہ انسان درحقیقت جس کا بندہ ہے وہ تو اُس کی آنکھوں سے اوجھل اور اس کے حواس سے دُور ہے۔ لیکن اس کے برعکس ایک شیطان خود آدمی کے اپنے نفس میں موجود ہے جو ہر وقت کہتا رہتا ہے کہ تو میرا بندہ ہے اور لاکھوں کروڑوں شیطان ہر طرف دُنیا میں پھیلے ہوئے ہیں جن میں سے ہر ایک دعوٰے کرتا ہے کہ تو میرا بندہ ہے۔ یہ شیاطین آدمی کو محسوس ہوتے ہیں، نظر آتے ہیں اور ہر آن نت نئے طریقوں سے اپنی طاقت اس کو محسوس کراتے رہتے ہیں۔ ان دوگونہ اسباب سے یہ شعور کہ میں خُدا کا بندہ ہوں اور اس کے سوا مجھے کسی کی بندگی نہیں کرنی ہے، آدمی کے ذہن سے گم ہو جاتا ہے۔ اس کو زندہ اور کارفرما

رکھنے کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ انسان خُدا کی خدائی کا زبان سے اقرار کرے۔ یا محض ایک علمی فارمولا کی حیثیت سے اس کو سمجھ لے بلکہ اس کے لیے قطعاً ناگزیر ہے کہ اسے بار بار ابھارا اور تازہ کیا جائے یہی کام نماز کرتی ہے۔ صبح اُٹھتے ہی سب کاموں سے پہلے وہ آپ کو یہی بات یاد دلاتی ہے۔ پھر جب آپ دن کو اپنے کام کاج میں مشغول ہوتے ہیں تو وہ ہنگامۂ سعی و عمل کے دوران میں دو دفعہ آپ کو تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے الگ کھینچ بلاتی ہے تاکہ احساسِ بندگی کا نقش اگر دھندلا ہو گیا ہو تو اسے تازہ کر دے۔ پھر شام کو جب تفریحوں اور دل چسپیوں کا وقت آتا ہے تو پھر یہ آپ کو آگاہ کرتی ہے کہ تم خُدا کے بندے ہو شیطانِ نفس کے بندے نہیں ہو۔ اس کے بعد رات آتی ہے، وہ رات جسے اندر کا شیطان اور باہر کے شیاطین سب مل کر معصیتوں سے سیاہ کر دینے کے لیے دن بھر منتظر رہتے ہیں۔ نماز پھر آپ کو خبردار کرتی ہے کہ تمہارا کام خُدا کی بندگی کرنا ہے نہ کہ ان شیاطین کی۔

یہ نماز کا پہلا فائدہ ہے۔ اسی بنا پر اسے قرآن میں ذکر کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، جس کے معنی یاد دہانی کے ہیں۔ اگر نماز میں اس کے سوا اور کچھ نہ ہوتا، تب بھی صرف یہی ایک صفت اس کو رکنِ اسلام قرار دینے کے لیے کافی تھی۔ کیونکہ اس فائدے کی اہمیت پر جتنا زیادہ غور کیا جائے اتنا ہی زیادہ اس امر کا یقین حاصل ہوتا ہے کہ آدمی کا عملاً بندۂ خُدا بن کر رہنا اس یاد دہانی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

فرض شناسی پھر چونکہ آپ کو اس زندگی میں ہر قدم پر خدا کے احکام بجا لانے ہیں، خدا کی سپرد کی ہوئی خدمات اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کی نگہداشت کے ساتھ انجام دینی ہیں، اس لیے یہ بھی ضروری ہے کہ آپ میں فرض شناسی پیدا ہو اور فرض کو مستعدی اور فرماں برداری کے ساتھ انجام دینے کی عادت آپ کی فطرت ثانیہ بن جائے۔ جو شخص یہ جانتا ہی نہ ہو کہ فرض کیا بلا ہوتی ہے اور اس کا فرض ہونا کیا معنی رکھتا ہے، ظاہر ہے کہ وہ کبھی ادائے فرض کے قابل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح جو شخص فرض کے معنی تو جانتا ہو مگر اس کی تربیت اتنی خراب ہو کہ فرض کو فرض جاننے کے باوجود اسے ادا کرنے کی پرواہ نہ کرے، اس کے کیرکٹر پر کوئی اعتماد نہیں کیا جا سکتا، اور نہ وہ کسی عملی خدمت (Active Service) کا اہل ہو سکتا ہے۔ پس یہ بالکل ناگزیر ہے کہ جن لوگوں کو کسی ذمہ دارانہ خدمت پر مامور کیا جائے، ان کے لیے فرض شناسی اور اطاعت امر کی تربیت کا بھی انتظام کیا جائے۔ اس کا فائدہ صرف یہی نہیں ہے کہ کام کے آدمی تیار ہوتے رہتے ہیں بلکہ اس کا فائدہ یہ بھی ہے کہ روزانہ کارآمد آدمیوں اور ناکارہ آدمیوں کے درمیان تمیز ہوتی رہتی ہے۔ روز یہ فرق کھلتا رہتا ہے کہ جو لوگ خدمت کے امیدوار ہیں ان میں کون قابلِ اعتماد ہے اور کون نہیں ہے۔ تمام عملی خدمات کے لیے یہ قطعاً ضروری ہے کہ ہمیشہ بالالتزام عملی آزمائش (Practical Test) پر آدمیوں کو پرکھا جاتا رہے تاکہ ناقابلِ

اعتماد آدمی ملازمت میں نہ رہنے پائیں۔

فوج کو دیکھیے، کن کن طریقوں سے وہاں ڈیوٹی کو سمجھنے اور اسے ادا کرنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ رات دن میں کئی کئی بار بگل بجایا جاتا ہے۔ سپاہیوں کو ایک جگہ حاضر ہونے کا حکم دیا جاتا ہے۔ ان سے قواعد کرائی جاتی ہے۔ یہ سب کس لیے؟ اس کا پہلا مقصد یہ ہے کہ سپاہیوں کو حکم بجا لانے کی عادت ہو۔ ان میں فرض شناسی کا مادہ پیدا ہو۔ ان میں ضبط نظام اور ترتیب کے ساتھ کام کرنے کی خصلت پیدا ہو۔ اور اس کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ روزانہ سپاہیوں کی آزمائش کی جاتی رہے۔ روز یہ فرق ہوتا رہے کہ جو لوگ فوج میں بھرتی ہوئے ہیں ان میں سے کون کام کے آدمی ہیں اور کون ناکارہ ہیں۔ جو سست اور نالائق لوگ بگل کی آواز سن کر گھر بیٹھے رہیں یا قواعد میں حکم کے مطابق حرکت نہ کریں انہیں پہلے ہی فوج سے نکال باہر کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ان پر یہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کہ جب کام کا وقت آئے گا تو وہ فرض کی پکار پر لبیک کہیں گے۔

دنیوی فوجوں کے لیے تو کام کا وقت کبھی برسوں میں آتا ہے، اور اس کے لیے یہ اہتمام ہے کہ روزانہ سپاہیوں کی تربیت اور ان کی آزمائش کی جاتی ہے مگر اسلام جو فوج بھرتی کرتا ہے اس کے لیے ہر وقت کام کا وقت ہے۔ وہ ہر وقت برسرکار (On Duty) ہے۔ اس کے لیے ہر وقت معرکۂ کارزار گرم ہے۔ اسے زندگی میں ہر آن، ہر لمحہ فرائض ادا کرنے ہیں، خدمات بجا لانی ہیں، شیطانی قوتوں سے لڑنا ہے، حدود اللہ کی حفاظت کرنی ہے۔ اور

احکام شاہی کو نافذ کرنا ہے۔ اسلام محض ایک اعتقادی مسلک نہیں ہے بلکہ عملی خدمت ہے اور عملی خدمت بھی ایسی جس میں رخصت، تعطیل، آرام کا کوئی وقت نہیں۔ رات دن کے چوبیس گھنٹے پیہم اور مسلسل خدمت ہی خدمت ہے۔ اب فوج کی مثال کو سامنے رکھ کر اندازہ کیجیے کہ ایسی سخت عملی خدمت کے لیے کتنے سخت ڈسپلن، کیسی زبردست تربیت اور کتنی شدید آزمائش کی ضرورت ہے۔ محض عقیدہ (Creed) کا زبانی اقرار اس کے لیے کیونکر کافی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اس فوج میں رکھ لیا جائے جس کو اتنی اہم خدمت انجام دینی ہے۔ عقیدے کا اقرار تو صرف اس ملازمت میں داخل ہونے کے لیے امیدواری کا اعلان کیا ہے۔ اس اعلان کے بعد یہ قطعاً ناگزیر ہے کہ اسے ڈسپلن کے شکنجہ میں کسا جائے۔ اس ڈسپلن میں رہ کر ہی وہ اسلام کے کام کا بن سکتا ہے۔ اور اگر وہ اپنے آپ کو اس شکنجہ کی گرفت میں دینے پر تیار نہیں، اگر وہ فرض کی پکار پر نہیں آتا، اگر وہ احکام کی اطاعت کے لیے کوئی مستعدی اپنے اندر نہیں رکھتا تو وہ اسلام کے لیے قطعی ناکارہ ہے۔ خدا اور اس کے دین کو ایسے فضول آدمی کی کوئی حاجت نہیں۔

یہی دوگونہ اغراض ہیں جن کے لیے نماز رات دن میں پانچ وقت فرض کی گئی ہے۔ یہ روزانہ پانچ بار بگل بجائی جاتی ہے تاکہ اللہ کے سپاہی اس کو سن کر ہر طرف سے دوڑے چلے آئیں اور ثابت کریں کہ وہ فرمان کو پہچانتے ہیں۔ اللہ کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہیں، اور اس کے احکام

بجا لانے کے لیئے مستعد ہیں۔ اس طریقہ سے ایک طرف سپاہیوں کی تربیت ہوتی ہے اور دوسری طرف مومن اور منافق کا فرق کھلتا رہتا ہے۔ جو لوگ اس آواز پر پابندی کے ساتھ آتے ہیں اور ضابطہ کے مطابق حرکت کرتے ہیں، ان میں فرض شناسی، مستعدی، انضباط اور اطاعتِ امر کا مادہ نشوونما پاتا ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ اس آواز کو سن کر اپنی جگہ سے نہیں ہلتے وہ اپنے عمل سے ثابت کر دیتے ہیں کہ یا تو وہ فرض کو پہچانتے نہیں، یا پہچانتے ہیں تو اسے ادا کرنے کے لیے مستعد نہیں ہیں۔ یا تو وہ اس اقتدار (Authority) ہی کو تسلیم نہیں کرتے جس نے اسے فرض قرار دیا ہے، یا پھر اُن کی ذہنی حالت اتنی ناقص ہے کہ جسے اپنا الٰہ اور رب مانتے ہیں اس کے پہلے اور اہم ترین حکم کو بجا لانے کے لیے تیار نہیں وہ اگر ایمان رکھتے بھی ہیں تو صادق الایمان (True of their conviction) نہیں ہیں۔ ان میں یہ صفت اور صلاحیت موجود نہیں ہے کہ جس چیز کو حق جانیں اس کے مطابق عمل کرنے کی زحمت بھی اٹھانے کے لیے تیار ہوں۔ پہلی صورت میں وہ مسلمان نہیں ہیں اور دوسری صورت میں وہ اتنے نالائق اور ناکارہ ہیں کہ اسلامی جماعت میں رہنے کے قابل نہیں۔

اسی بنا پر قرآن میں نماز کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ اِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ[1] یعنی جو لوگ خدا کی اطاعت و بندگی کے لیے تیار نہیں ہیں صرف انہی پر نماز گراں گذرتی ہے۔ بالفاظ دیگر جس پر نماز گراں گزرے

---

[1] بے شک یہ (نماز) ایک مشکل کام ہے، مگر فرمانبرداروں کے لیے مشکل نہیں (البقرہ-۵م)

وہ خود اس بات کا ثبوت پیش کرتا ہے کہ خدا کی بندگی و اطاعت کے لیے تیار نہیں ہے۔

اسی بنا پر ارشاد ہُوا کہ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلوٰةَ وَآتَوُا الزَّكوٰةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ[1] "اگر وہ کفر و شرک سے توبہ کریں اور نماز کے پابند ہوں اور زکوٰۃ دیں تب وہ تمھارے دینی بھائی ہیں" یعنی نماز کے بغیر آدمی اسلام کی دینی برادری میں شامل ہی نہیں ہو سکتا۔

اس بنا پر قرآن کے بارے میں فرمایا کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلوٰةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ[2] "یہ کتاب صرف اُن خداترس لوگوں کے لیے ہدایت ہے جو اَن دیکھی حقیقت پر ایمان لائیں اور نماز کے پابند بنیں اور جو رزق ہم نے دیا ہے اس میں سے راہِ خدا میں دیں۔"

اسی بنا پر منافقین کی یہ صفت بیان کی گئی کہ وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلوٰةِ قَامُوا كُسَالَىٰ[3] "یعنی وہ نماز کے لیے اُٹھتے ہیں تو اس طرح کسمساتے ہوئے بادلِ ناخواستہ اٹھتے ہیں کہ گویا ان کی جان پر بن رہی ہے"، اور الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ[4] "یعنی وہ اپنی نمازوں سے غافل ہوتے ہیں۔"

اسی بنا پر حدیث میں ارشاد ہُوا ہے کہ بین العبد وبین الکفر ترک الصلوٰۃ[5] "بندے اور کفر کے درمیان ترکِ صلوٰۃ واسطہ ہے" یعنی ترکِ صلوٰۃ وہ پُل ہے جس کو عبور کرکے آدمی ایمان سے کفر کی طرف جاتا ہے۔

---

[1] التوبہ-۱۱۔ [2] البقرہ ۲-۳۔ [3] النساء-۱۴۲۔ [4] الماعون [5] مسلم، کتاب الصلوٰۃ

اسی بنا پر رحمۃ للعالمینؐ نے فرمایا کہ "جو لوگ اذان کی آواز سن کر گھروں سے نہیں نکلتے، میرا جی چاہتا ہے کہ جا کر ان کے گھروں میں آگ لگا دوں۔" اور اسی بنا پر فرمایا کہ العھد بیننا و بینھم الصلوٰۃ فمن ترکھا فقد کفر۔[۲] ہمارے اور عرب کے بدوؤں کے درمیان تعلق کی بنا نماز ہے۔ جس نے اسے چھوڑ دیا وہ کافر قرار پائیگا اور اس سے ہمارا تعلق اٹھ جائیگا۔

آج دین سے قطعی ناواقفیت کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ نماز نہیں پڑھتے، جو اذان کی آواز سن کر ٹس سے مس نہیں ہوتے، جن کو یہ محسوس تک نہیں ہوتا کہ مؤذن کس کو بلا رہا ہے اور کس کام کے لیے بلا رہا ہے، وہ مسلمان سمجھے جاتے ہیں، اور یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ نماز کی کوئی اہمیت اسلام میں نہیں ہے، اس کے بغیر بھی آدمی مسلمان ہو سکتا ہے بلکہ مسلمانوں کا امام اور ملت کا قائد بھی ہو سکتا ہے۔ مگر جب اسلام ایک تحریک کی حیثیت سے زندہ تھا، اس وقت یہ حال نہ تھا۔ مستند روایت ہے کہ کان اصحاب النبی صلعم لا یرون شیئاً من الاعمال ترکہ کفر غیر الصلوٰۃ۔[۳] یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں یہ بات متفق علیہ تھی کہ اسلامی اعمال میں سے صرف نماز ہی وہ عمل ہے جس کو چھوڑ دینا کفر ہے۔

تعمیر سیرت

نماز کا تیسرا اہم کام یہ ہے کہ وہ انسان کی سیرت کو اس خاص ڈھنگ پر تیار کرتی ہے جو اسلامی زندگی بسر کرنے، یا بالفاظ دیگر زندگی کو خدا کی عبادت بنا دینے کے لیے ضروری ہے۔

---

[۱] ترمذی، نسائی، ابن ماجہ [۲] ترمذی۔

دُنیا میں ہر جگہ آپ دیکھتے ہیں کہ جیسا کام کسی جماعت کو کرنا ہوتا ہے، جیسے مقاصد اس کے پیشِ نظر ہوتے ہیں انہی کے لحاظ سے سیرت بنانے کے لیے ایک نظامِ تربیت وضع کیا جاتا ہے۔ مثلاً سلطنتوں کی سول سروس کا مقصد وفاداری کے ساتھ ملک کا انتظام کرنا ہوتا ہے، اس لیے سول سروس کی ٹریننگ میں تمام تر زور حکومت مقتدرہ کی وفاداری اور نظمِ مملکت (Administration) کی صلاحیتیں پیدا کرنے ہی پر صرف کیا جاتا ہے۔ تقویٰ اور طہارت کا وہاں کوئی سوال نہیں ہوتا۔ پرائیویٹ زندگی خواہ کتنی ہی گندی کیوں نہ ہو، ایک شخص اس کے باوجود سول سروس میں داخل ہو سکتا اور ترقی کر سکتا ہے۔ کیونکہ حکومت میں راستی اور حق کے اصولوں کی پابندی کرنا اور اخلاق کو سیاست کی بنیاد بنانا وہاں سرے سے پیشِ نظر ہی نہیں ہے۔ اسی طرح فوجوں کی تنظیم کا مقصد جنگ کی قابلیت بہم پہنچانا ہوتا ہے۔ اس لیے سپاہیوں کی تربیت محض اس نقطۂ نظر سے کی جاتی ہے کہ انہیں مار دھاڑ کے لیے تیار ہونا ہے۔ انہیں پریڈ کرائی جاتی ہے تاکہ وہ منتظم صورت میں کام کر سکیں، انہیں اسلحہ کا استعمال سکھایا جاتا ہے تاکہ کشت و خون کے فن میں ماہر ہو جائیں۔ ان کو اطاعتِ امر کا خوگر بنایا جاتا ہے تاکہ حکومت جہاں اور جس غرض کے لیے بھی ان کے دست و بازو سے کام لینا چاہے وہاں وہ بے تأمل کام کریں۔ اس کے ماسوا کوئی بلند تر اخلاقی مقصد چونکہ پیشِ نظر نہیں ہوتا اس لیے فوجوں کی سیرت میں تقویٰ پیدا کرنے کا خیال تک کسی کو نہیں آتا۔ سپاہی اگر ڈسپلن کے

پابند ہیں تو حکومت کے مقصد کے لئے بس یہی کافی ہے۔ اس کے بعد کچھ پرواہ نہیں اگر وہ زانی، شرابی، جھوٹے، بد دیانت اور غدار ہوں۔

اسلام اس کے برعکس ایک ایسی جماعت تیار کرنا چاہتا ہے جس کا مقصد اوّل نیکی کو قائم کرنا اور بدی کو مٹانا ہے، جس کو سیاست، عدالت، تجارت، صنعت، صلح و جنگ، بین الاقوامی تعلقات، غرض تمدن کے ہر شعبے میں اخلاق کے مستقل اصولوں کی پابندی کرنی ہے، جسے زمین پر خدا کے قانون کو نافذ کرنا ہے۔ اس لئے وہ اپنے اہل کار، سپاہی اور افسر ایک دوسرے نظامِ تربیت کے تحت تیار کرتا ہے تاکہ ان کے اندر وہ سیرت پیدا ہو جو اس خاص نوعیت کی خدمت سے مناسبت رکھتی ہے۔ اس سیرت کی بنیاد اسلام کے ایمانیات ہیں۔ خدا کا خوف، اس کی محبت، اس کا عشق، اس کی خوشنودی کو مقصدِ زندگی قرار دینا، اس کو حاکم اصلی سمجھنا، اس کے سامنے اپنے آپ کو جواب دہ خیال کرنا، اور یہ جاننا کہ ایک روز وہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے، یہی وہ اساسی تصورات ہیں جن پر اسلامی سیرت کی بنا قائم ہوتی ہے۔ مسلمان اسلام کے طریقہ پر ایک قدم نہیں چل سکتا جب تک کہ اسے یہ یقین نہ ہو کہ خدا ہر وقت ہر جگہ ہر حال میں اسے دیکھ رہا ہے، اس کی ہر ہر حرکت سے باخبر ہے۔ اندھیرے میں بھی اس کو دیکھتا ہے، تنہائی میں بھی اس کے دل میں جو نیت چھپی ہوئی ہے اس کو بھی وہ جانتا ہے، اس کے دماغ میں جو خیالات اور ارادے پیدا ہوتے ہیں ان سے بھی وہ ناواقف نہیں۔ تمام دنیا سے چھپ جانا ممکن ہے مگر خدا سے چھپنا غیر ممکن۔ تمام دنیا کی سزاؤں سے

آدمی بچ سکتا ہے مگر خُدا کی سزا سے نہیں بچ سکتا۔ دُنیا میں نیکی ضائع ہو سکتی ہے بلکہ نیکی کا بدلہ بدی کی صورت میں مل سکتا ہے مگر خدا کے ہاں یہ ممکن نہیں، دُنیا کی نعمتیں محدود ہیں مگر خُدا کی نعمتیں بے حد و حساب ہیں دُنیا کا نفع و نقصان فانی و آنی ہے مگر خدا کے ہاں جو نفع یا نقصان ہے وہ پائدار ہے۔ یہی یقین آدمی کو خُدا کے احکام کی اطاعت اور اس کے قانون کی پیروی کے لیے تیار کرتا ہے۔ اسی اعتقاد کے زور سے وہ حلال و حرام کی ان حدود کا لحاظ رکھنے پر آمادہ ہوتا ہے جو خُدا نے زندگی کے معاملات میں قائم کی ہیں۔ یہی چیز اسے خواہشات کی بندگی سے، ناجائز منفعتوں اور لذّتوں کے لالچ سے اور بداخلاقی کے مفید مطلب ذرائع اختیار کرنے سے روکتی ہے۔ اسی عقیدے میں یہ طاقت ہے کہ آدمی کو عدل، صداقت، حق شناسی و حق پرستی اور مکارمِ اخلاق کی صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رکھے، اور اسے دُنیا کی اصلاح کے اس کٹھن کام پر اُٹھنے کے لیے آمادہ کرے جس کی دشواریوں اور ذمہ داریوں کا تصوّر بھی کوئی غیر مومن انسان، برداشت نہیں کر سکتا۔

نماز وہ چیز ہے جو ان تصورات کو بار بار تازہ کرتی اور ذہن میں گہری جڑوں کے ساتھ بٹھاتی رہتی ہے۔ اگر آپ غور سے دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو کہ نماز کا ارادہ کرنے کے ساتھ ہی اسلامی سیرت کی تعمیر کا عمل شروع ہو جاتا ہے، اور پھر ایک ایک حرکت، ایک ایک فعل، اور ایک ایک قول جو نماز سے متعلق ہے، کچھ اس طور پر رکھا گیا ہے کہ اس سے خود بخود آدمی کی

سیرت اسلام کے سانچے میں ڈھلتی چلی جاتی ہے۔

دیکھیے! نماز کا ارادہ کرتے ہی سب سے پہلے آپ اپنا جائزہ لیتے ہیں کہ ناپاک تو نہیں ہوں؟ کپڑے تو نجس نہیں ہیں؟ وضو ہے یا نہیں؟ غور کیجئے یہ خیال آپ کو کیوں آتا ہے؟ اگر آپ نجس حالت میں نماز کے لیے کھڑے ہوں، یا بے وضو کھڑے ہو جائیں تو کون آپ کو پکڑ سکتا ہے کس کو آپ کے حال کی خبر ہو سکتی ہے؟ پھر آپ ایسا کیوں نہیں کرتے؟ اس کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ آپ کو خدا کا خوف ہے، اس بات کا یقین ہے کہ اس سے کوئی راز نہیں چھپ سکتا اور اس پر ایمان ہے کہ آخرت میں اس فعل کا جواب دینا پڑے گا۔ یہی چیز آپ سے طہارت اور وضو کے ان تمام قواعد و ضوابط کی پابندی کراتی ہے جو نماز کے لیے مقرر کیے گئے ہیں، ورنہ کوئی دنیوی طاقت ایسی موجود نہیں ہے جو آپ سے ان کی پابندی کرانے والی ہو۔

اس کے بعد آپ نماز شروع کرتے ہیں۔ یہاں آپ کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ قیام و قعود اور رکوع و سجود کی حالتوں میں قرآن کی آیات یا دعائیں یا تسبیحیں جس جس طرح پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے اسی طرح ان کو پڑھیں۔ آخر یہ پابندی آپ کیوں کرتے ہیں؟ یہ ساری چیزیں تو آہستہ پڑھی جاتی ہیں۔ اگر آپ انہیں نہ پڑھیں یا ان کی جگہ کچھ اور پڑھ دیں، یا ان میں اپنی طرف سے کچھ الٹی سیدھی باتیں ملا دیں تو کسی کو بھی آپ کے اس فعل کی خبر نہیں ہو سکتی۔ پھر بتائیے، کس کا خوف، کس کے واقفِ اسرار ہونے کا یقین اور کس کی جزا و سزا پر ایمان آپ کو ٹھیک ٹھیک نماز ادا

کرنے پر مجبور کرتا ہے؟

نماز کے اوقات آپ پر مختلف حالتوں میں آتے ہیں۔ کبھی آپ جنگل میں ہوتے ہیں، کبھی رات کے اندھیرے میں، کبھی گھر کی تنہائی میں، کبھی اپنی دلچسپ تفریحوں میں مشغول ہوتے ہیں، اور کبھی اپنے کاروبار میں منہمک کبھی سردی کی شدت لحاف سے سر نکالنے کی اجازت تک نہیں دیتی اور کبھی چلچلاتی دھوپ گھر سے قدم نکالتے ہی بھون ڈالنے پر آمادہ ہوتی ہے۔ غرض اسی طرح بے شمار مختلف حالتیں آپ پر رات دن میں آتی رہتی ہیں۔ ان سب حالتوں میں کون سی طاقت آپ کو نماز کی طرف کھینچ کرلے جاتی ہے؟ اگر وہ خدا پر ایمان، اس کے سمیع وعلیم ہونے کا یقین، اس کی ناراضی کا خوف اور اس کی رضا کی طلب نہیں تو اور کیا ہے؟ ضروری نہیں کہ یہ سب تصوّرات آپ کے شعور جلی ہی میں تازہ رہیں۔ سیرت در اصل اُن تصوّرات سے بنتی ہے جو شعور خفی میں پیوستہ ہوتے ہیں۔ شعور کی گہرائی میں جو تصوّر اتر جاتا ہے وہی حقیقت میں مستحکم ہوتا ہے اور اسی سے مستقل خصائل اور اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔

اب ذرا ان چیزوں پر نظر ڈالیے جو نماز میں پڑھی جاتی ہیں۔ ان میں اول سے لے کر آخر تک ایک ایک لفظ ایسا ہے جو اسلام کے بنیادی تصوّرات اور اس کی اسپرٹ سے لبریز ہے۔ ان مضامین کو بار بار پڑھنے سے وہ تمام ایمانیات بار بار تازہ اور بار بار ذہن نشین ہوتے رہتے ہیں جن پر اسلامی سیرت کی عمارت کھڑی کی گئی ہے!

سب سے پہلے اذان کو لیجئے۔ روزانہ پانچ وقت آپ کو کن الفاظ میں نماز کی اطلاع دی جاتی ہے ؟ اللہ اکبر، اللہ اکبر۔" خدا سب سے بڑا ہے"۔ اشھد ان لآ الٰہَ اِلاّ اللّٰہ " میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔ کوئی اس لائق نہیں کہ اس کی بندگی کی جائے۔" اَشْہَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰہِ " میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے رسول ہیں"۔ حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ " آؤ نماز کے لیے"۔ حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ۔ آؤ اس کام کے لیے جس میں فلاح اور بہبودگی ہے"۔ اللّٰہُ اکبر، اللّٰہُ اکبر " اللہ سب سے بڑا ہے"۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ " اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

دیکھو! یہ کیسی زبردست پکار ہے۔ ہر روز پانچ مرتبہ یہ آواز کس طرح تمہیں یاد دلاتی ہے کہ زمین میں جتنے خدائی کے دعویدار بنے ہوئے ہیں، سب جھوٹے ہیں۔ زمین و آسمان میں صرف ایک ہی ہستی ہے جس کے لیے بڑائی ہے۔ اور وہی عبادت کے لائق ہے، آؤ اسی کی عبادت کرو۔ اسی کی عبادت میں تمہارے لیے دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے۔ کون ہے جو اس آواز کو سن کر ہل نہ جائے گا ؟ کیونکر ممکن ہے کہ جس کے دل میں ایمان ہو۔ وہ اتنی بڑی بات کی گواہی اور ایسی زبردست پکار کو سن کر اپنی جگہ بیٹھا رہ جائے اور اپنے مالک کے آگے سر جھکانے کے لیے دوڑ نہ پڑے۔

اس کے بعد تم نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہو۔ منہ قبلہ کے سامنے ہے۔

پاک صاف ہو کر بادشاہِ عالم کے دربار میں حاضر ہو۔ سب سے پہلے تم کانوں تک ہاتھ اٹھاتے ہو، گویا دُنیا و مافیہا سے دست بردار ہو رہے ہو[1] پھر اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھ لیتے ہو[2] گویا اب بالکل اپنے بادشاہ کے سامنے مؤدب دست بستہ کھڑے ہو۔ اب تمہاری زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہیں: اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ: "میں نے یکسو ہو کر اپنا رُخ اس ذات کی طرف پھیر دیا جس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا ہے۔ اور میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو خدائی میں کسی کو اس کا شریک ٹھیراتے ہیں۔"

اس دو ٹوک بات کا اقرار کر کے تم کیا عرض و معروض کرتے ہو؟۔ سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالٰی جَدُّکَ وَلَآ اِلٰہَ غَیْرُکَ۔ "پاک[3] ہے تو اے خدا۔ تعریف و ستائش ہے تیرے لیے۔ برکت والا ہے۔

---

[1] ہاتھ اٹھانا دراصل دو چیزوں کی علامت ہے۔ ایک تسلیم (Surrender) یعنی مزاحمت ترک کر کے اپنے آپ کو سپرد کر دینا۔ دوسرے دست برداری، یعنی جن چیزوں سے آدمی اب تک تعلق رکھتا تھا، ان سے اس نے ہاتھ اٹھا لیا۔

[2] کسی کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا انتہائی ادب و احترام اور خدمت و نیازمندی کا اظہار ہے۔ اسی لیے قدیم ترین زمانہ سے بادشاہوں نے اپنے درباری آداب میں اسے شامل کیا ہے۔ لیکن اسلام اسے صرف دربارِ الٰہی کی حاضری کے لیے خاص کرتا ہے۔

[3] پاک ہے" یعنی عیب، نقص، کمزوری اور غلطی سے پاک ہے۔" اور "تعریف و ستائش ہے تیرے لیے" یعنی تمام کمالات اور تمام خوبیوں سے تو متصف ہے۔

تیرا نام سب سے بلند و بالا ہے تیری بزرگی۔ اور کوئی معبود نہیں تیرے سوا۔"
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ "خدا کی پناہ مانگتا ہوں میں شیطانِ مردود کی دراندازی و شرارت سے۔"
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ شروع کرتا ہوں میں اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ "تعریف خدا کے لیے ہے جو سارے جہاں والوں کا رب ہے۔" اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ "نہایت رحمت والا اور بڑا مہربان ہے۔ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ "روزِ جزا کا حاکم ہے۔" اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ "مالک! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔" اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ "ہم کو سیدھی راستہ دکھا" صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ "ان لوگوں کا راستہ جن پر تُو نے فضل و انعام فرمایا ہے۔" غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ "جن سے تُو ناراض نہیں ہے اور جو راہِ راست سے بھٹکے ہوئے نہیں ہیں۔ آمین۔ خدایا ایسا ہی ہو۔ مالک ہماری اس دُعا کو قبول کر۔"

اس کے بعد تم قرآن کی کچھ آیتیں پڑھتے ہو جن میں سے ہر ایک میں اسلام کے اساسی اصول، اس کی اخلاقی تعلیمات، اس کی عملی ہدایات بیان کی گئی ہیں۔ اور اس راہِ راست کے نشانات دکھائے گئے ہیں جس کی طرف رہنمائی کی درخواست ابھی اس سے پہلے تم نے کی ہے۔ مثلاً:۔
وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ "زمانہ کی قسم (یعنی زمانہ اس بات پر گواہ ہے) کہ آدمی نقصان میں ہے۔" اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

"سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے"
وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ[1] اور جو ایک دوسرے کو حق پر چلنے اور
اس پر ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتے رہے" ان مختصر جملوں میں انسان
کو بتایا گیا ہے کہ تو بربادی و نامرادی سے بچ نہیں سکتا، جب تک کہ خدا
پرستی و نیک عملی اختیار نہ کرے، اور صرف انفرادی نیکی ہی کافی نہیں ہے،
بلکہ تیری فلاح کے لئے ناگزیر ہے کہ تیری سوسائٹی ایسی ہو جس میں حق
پرستی کی روح کارفرما ہو۔ تیری اپنی تاریخ اس حقیقت پر گواہی دے
رہی ہے۔ یا مثلاً أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ "تُو نے دیکھا اس
شخص کو جو روزِ جزا کو نہیں مانتا (وہ کیسا آدمی ہوتا ہے؟) فَذَٰلِكَ الَّذِي
يَدُعُّ الْيَتِيمَ "ایسا ہی آدمی یتیم کو دھتکارتا ہے" وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ
الْمِسْكِينِ "اور مسکین کو آپ کھانا کھلانا درکنار دوسروں سے بھی یہ کہنا
پسند نہیں کرتا کہ غریب کو کھانا کھلاؤ" فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَن
صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ[2]
"پھر افسوس ہے ان نمازیوں پر جو (آخرت کو نہ ماننے ہی کی وجہ سے) نماز سے
غفلت کرتے ہیں، اور پڑھتے بھی ہیں تو محض لوگوں کو دکھانے کے لیے، اور
ان کے دل ایسے چھوٹے ہوتے ہیں کہ ذرا ذرا سی چیزیں حاجت مندوں کو
دیتے ہوئے بھی ان کا دل دکھتا ہے" ان چھوٹے چھوٹے پُراثر فقروں
میں یہ بات ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ آخرت کا اعتقاد آدمی کی اخلاقی

---

[1] العصر۔ [2] الماعون۔

زندگی میں کیا اثر رکھتا ہے۔ اور اس عقیدے پر ایمان نہ ہونے کی وجہ سے
آدمی کا اجتماعی برتاؤ اور انفرادی رویہ کس طرح خلوص اور ہمدردی سے
خالی ہو جاتا ہے۔

یا مثلاً وَیْلٌ لِّکُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ "افسوس ہے ہر اس شخص کے حال
پر جو دوسروں کی عیب چینی کرتا ہے اور آوازے کستا پھرتا ہے" الَّذِي
جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهُ "روپیہ جمع کرتا اور گن گن کر رکھتا ہے" يَحْسَبُ
أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ "سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کا ساتھ دے گا"
كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ "ہرگز نہیں۔ ایک دن آنے والا ہے جب وہ
یقیناً حطمہ میں ڈالا جائے گا" وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ "اور تجھے کیا خبر
حطمہ کیا چیز ہے" نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ "اللہ کی
بھڑکائی ہوئی آگ، جس کی لپٹیں دلوں پر چھا جائیں گی" إِنَّهَا عَلَيْهِم مُّؤْصَدَةٌ
فِي عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ[1] "وہ اونچے اونچے ستونوں جیسے شعلوں کی صورت میں ان
کو گھیرے گی"

یہ محض دو تین نمونے ہیں جن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہر نماز میں
قرآن کا کوئی نہ کوئی حصہ پڑھنا کس لیے لازم کیا گیا ہے۔ اس سے غرض یہی
ہے کہ روزانہ کئی کئی وقت خدا کے احکام، اس کی ہدایات، اور اس کی تعلیمات
بار بار آدمی کو یاد دلائی جاتی رہیں۔ یہ دُنیا، یہ دار العمل جس میں کام کرنے کے
لیے انسان بھیجا گیا ہے، اسی طرح درست رہ سکتی ہے کہ اس کے اندر

---

[1] الھمزہ۔

کام کرنے کے دوران میں آدمی کو تھوڑے وقفوں کے بعد اُٹھ بلایا جاتا ہے تاکہ یہاں جس قانون اور جس ہدایت نامے (Instrument of Instructions) کے مطابق اسے کام کرنا ہے اس کی دفعات اس کی یاد میں تازہ ہوتی رہیں۔

ان ہدایتوں کے پڑھنے کے بعد تم اللہ اکبر کہتے ہوئے رکوع میں جاتے ہو۔ گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر اپنے بادشاہ کے آگے جھکتے[1] ہو اور بار بار کہتے ہو۔ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمُ۔ "پاک ہے میرا رب جو بڑا بزرگ ہے:" پھر سیدھے کھڑے ہو جاتے ہو اور کہتے ہو۔ سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ۔ "اللہ نے سُن لی اس شخص کی بات جس نے اس کی تعریف بیان کی"۔ پھر اللہ اکبر کہتے ہوئے سجدہ میں گر[2] جاتے ہو اور بار بار کہتے ہو۔ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی۔ "پاک ہے میرا مالک جو سب سے بالا و برتر ہے"۔ پھر اللہ اکبر کہہ کر سر اٹھاتے ہو، ادب سے بیٹھ جاتے ہو اور یہ الفاظ زبان سے ادا کرتے ہو:۔

اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلَوٰاتُ وَالطَّیِّبَاتُ۔ "ہماری سلامیاں، ہماری

---

[1] یہ رکوع اس تسلیم و سپردگی کی مزید ترقی ہے جس کی ابتداء نماز کے شروع میں ہاتھ اٹھا کر کی گئی تھی۔

[2] یہ اسی تسلیم و سپردگی کی تکمیل ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بندے نے اپنا وہ سر جس میں خودی و خود سری اور انانیت و خود پرستی رہتی ہے، خدا کے آگے زمین پر ٹیک دیا۔ اب اس سر میں خود مختاری کے سودے کا کوئی شائبہ باقی نہیں رہا۔ بندہ اب پوری طرح اپنے خدا کا تابع فرمان ہے۔

نمازیں اور ہمارے تمام اچھے کام اللہ کے لیے ہیں "اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ اَیُّهَا النَّبِیُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ۔ سلام ہو آپ پر اے نبی. اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں آپ پر نازل ہوں۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰهِ الصّٰلِحِیْنَ سلامتی ہو ہم پر اور اللہ کے سب نیک بندوں پر۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے بندے اور رسول ہیں" یہ شہادت دیتے وقت سیدھے ہاتھ کی انگلی اٹھائی جاتی ہے، کیونکہ یہ نماز میں مسلمان کے عقیدے کا اعلان (Declaration) ہے اور اس کو زبان سے ادا کرتے وقت خاص طور پر توجہ اور زور دینے کی ضرورت ہے۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓی اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّیْتَ عَلٰٓی اِبْرَاهِیْمَ وَعَلٰٓی اٰلِ اِبْرَاهِیْمَ اِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔ خدایا رحمت فرما محمدؐ اور آل محمدؐ پر جس طرح تونے رحمت فرمائی ابراہیمؑ اور آل ابراہیمؑ پر، تو قابل تعریف اور صاحب عظمت ہے۔ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓی اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰٓی اِبْرَاهِیْمَ وَعَلٰٓی اٰلِ اِبْرَاهِیْمَ اِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔ خدایا برکت عطا فرما محمدؐ اور آلِ محمدؐ کو جس طرح تونے برکت دی ابراہیمؑ اور آلِ ابراہیمؑ کو، تو قابل تعریف اور صاحب عظمت ہے۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِیْحِ الدَّجَّالِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْیَا وَالْمَمَاتِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْمَاْثَمِ وَالْمَغْرَمِ۔

خدایا تیری پناہ مانگتا ہوں دوزخ کے عذاب سے اور تیری پناہ مانگتا ہوں دجال کے فتنہ سے۔ اور تیری پناہ مانگتا ہوں زندگی اور موت کے فتنہ سے، اور تیری پناہ مانگتا ہوں بُرے اعمال سے، اور دوسروں کے حقوق کی ذمہ داری سے "

یہ ہیں وہ عبارتیں جو رات دن کی پانچوں نمازوں میں بہ تکرار دہرائی جاتی ہیں۔ مگر رات کو سونے سے پہلے سب سے آخری نماز کی سب سے آخری رکعت میں ایک اور دعا پڑھی جاتی ہے جس کا نام دعائے قنوت ہے۔ یہ ایک عظیم الشان اقرار نامہ ہے جو سکون کے لمحوں میں بندہ اپنے خدا کے سامنے پیش کرتا ہے:-

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْتَعِیْنُكَ وَنَسْتَغْفِرُكَ وَنُؤْمِنُ بِكَ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْكَ وَنُثْنِیْ عَلَيْكَ الْخَيْرَ " خدایا ہم تجھ سے مدد مانگتے ہیں، تجھ سے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں، تجھ پر ایمان لاتے ہیں، تیرے ہی اوپر بھروسہ کرتے ہیں۔ اور تیری بہترین تعریف کرتے ہیں " وَنَشْكُرُكَ وَلَا نَكْفُرُكَ وَنَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ يَّفْجُرُكَ " ہم تیرا شکر ادا کریں گے، ناشکری نہیں کریں گے۔ جو تیری نافرمانی کرے گا، ہم اُسے چھوڑ دیں گے اور اس سے تعلق توڑ دیں گے " اَللّٰھُمَّ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَلَكَ نُصَلِّیْ وَنَسْجُدُ وَاِلَيْكَ نَسْعٰى وَنَحْفِدُ۔ خدایا ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں، تیرے ہی لیے نماز پڑھتے اور سجدہ کرتے ہیں۔ ہماری ساری کوششوں اور ساری دوڑ دھوپ کا مقصود تو ہے " وَنَرْجُوْا رَحْمَتَكَ وَنَخْشٰى عَذَابَكَ اِنَّ عَذَابَكَ

بالکفار مُلحِق۔ ہم تیری رحمت کے امیدوار ہیں، اور تیرے عذاب سے ڈرتے ہیں کہ یقیناً تیرا عذاب کفرانِ نعمت کرنے والوں کو آ لے گا۔"

یہ عبارتیں کسی شرح و بیان کی محتاج نہیں ہیں۔ ہر شخص ان سے خود دیکھ سکتا ہے کہ اسلام اپنی سپاہ، [illegible] اپنی فوج [illegible] سوسائٹی کے ہر فرد کو کن جذبات، [illegible] کے ساتھ تربیت کرتا ہے، کیا چیزیں ان کے [illegible] خصلتیں ان کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ [illegible] پر پڑھے تیار کی کوئی فوج اسلام کے کسی کام کی نہیں۔ محض انتظامی قابلیت رکھنے والی مردم [illegible] کی بھی اسے حاجت نہیں۔ ایسے نوجوان سپاہیوں اور ان کارکنوں کی حاجت ہے جن کے اندر باضابطگی کے ساتھ تقویٰ بھی ہو، جو سر کاٹنے اور سر کٹوانے کے ساتھ دل بدلنے اور اخلاق کو ڈھالنے کی طاقت بھی رکھتے ہوں جو صرف زمین کا انتظام کرنے والے ہی نہ ہوں بلکہ اہلِ زمین کی اصلاح کرنے والے بھی ہوں۔ اس نقطۂ نظر سے آپ دیکھئے تو آپ کا دل گواہی دے گا کہ اسلامی مقاصد کے لیے نماز سے موزوں، یا نماز سے بہتر کوئی دوسرا نظامِ تربیت ممکن نہیں ہے۔ جو شخص اس نظام کے تحت ٹھیک ٹھیک تربیت پائے، اسی سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ امانتوں اور ذمہ داریوں اور حقوق اللہ و حقوق العباد کا جو بار دنیوی زندگی میں اس پر ڈالا جائے گا اس کو وہ خدا ترسی کے ساتھ سنبھالے گا اور قعرِ دریا میں رہ کر بھی کبھی دامن تر نہ ہونے دے گا۔

اسی بنا پر قرآن میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ[1] یقیناً نماز بے حیائی اور بدی سے روکتی ہے:" اسی بنا پر قدیم ترین زمانہ سے نماز اسلامی تحریک کا لازمی جزر رہی ہے۔ جس قدر انبیاء خُدا کی طرف سے آئے ہیں ان سب کی شریعت میں نماز اولیں رکنِ اسلام تھی۔ کیونکہ اسلام کی تحریک میں جب کبھی زوال آیا، نماز کا نظامِ تربیت ٹوٹ جانے کی وجہ سے ہی آیا۔ فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا[2]۔ پھر ان کے بعد ایسے ناخلف لوگ آئے جنھوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور خواہشاتِ نفس کے پیچھے پڑ گئے، سو عنقریب وہ کج راہی میں مبتلا ہوں گے:" اس کی وجہ ظاہر ہے۔ اسلام کے طریقے پر چلنے کے لیے اسلامی سیرت ضروری ہے، اور اسلامی سیرت نماز کے نظامِ تربیت ہی سے بنتی ہے۔ جب یہ نظام ٹوٹے گا تو سیرتیں بگڑ جائیں گی۔ اور اس کا لازمی نتیجہ زوال و انحطاط (Degeneration) ہے۔

ضبطِ نفس

تعمیرِ سیرت کے ساتھ ساتھ نماز انسان میں ضبطِ نفس (Control) کی طاقت بھی پیدا کرتی ہے جس کے بغیر سیرت کا مدعا حاصل نہیں ہو سکتا۔ تعمیرِ سیرت کا کام بجائے خود اتنا ہے کہ یہ انسانی خودی (Human Ego) کو تربیت دے کر مہذب بنا دیتی ہے۔ لیکن اس تربیت یافتہ خودی کو ان جسمانی اور نفسانی قوتوں

---

[1] العنکبوت، ۴۵۔ [2] مریم، ۵۹۔

پر، جو اس کے لیے آلہ کی حیثیت رکھتی ہیں، عملاً پورا قابو
حاصل نہ ہو تو اس کی تربیت وتہذیب کا مقصود، یعنی صحیح برتاؤ اور ٹھیک
چلن (Right Conduct) حاصل نہیں ہو سکتا۔ ایک مثال کے پیرایہ
میں اس کو یوں سمجھیے کہ انسان ایک موٹر اور ایک ڈرائیور کے مجموعہ کا
نام ہے۔ یہ مجموعہ ٹھیک کام اسی حالت میں کر سکتا ہے جب کہ موٹر
کے تمام آلات اور اس کی تمام طاقتیں ڈرائیور کے قابو میں ہوں، اور
ڈرائیور مہذب، تربیت یافتہ اور واقفِ راہ ہو۔ اگر آپ نے ڈرائیور کو
تربیت دے کر تیار کر دیا، مگر اسٹیرنگ، بریک اور ایکسلریٹر پوری طرح
اس کے قابو میں نہ آئے، یا آئے تو سہی مگر ڈھیلے رہے تو اس صورت میں
ڈرائیور موٹر کو نہ چلائے گا بلکہ موٹر ڈرائیور کو چلائے گی، اور چونکہ موٹر
صرف چلنا جانتی ہے، بینائی، تمیز اور راستہ کی واقفیت نہیں رکھتی اس
لیے جب وہ ڈرائیور کو لے کر چلے گی تو اوندھے سیدھے راستوں پر جدھر
چاہے گی اسے کھینچے کھینچے پھرے گی۔ اس مثال کے مطابق انسان کی جسمانی
طاقتیں اور اس کی نفسانی خواہشات اور ذہنی قوتیں موٹر کے حکم میں ہیں،
اور اس کی خودی ڈرائیور کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ موٹر ویسی ہی جاہل ہے
جیسی لوہے والی موٹر ہوتی ہے، مگر وہ بے جان ہے اور یہ جان دار۔ یہ
خواہشات، جذبات اور داعیات بھی رکھتی ہے اور ہر وقت کوشش
کرتی رہتی ہے کہ ڈرائیور اس کو نہ چلائے، یہ ڈرائیور کو چلائے۔ تمام
انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا مقصود ڈرائیور کو اس طرح تیار کرنا ہے

کہ وہ اس موٹر کو اپنے اوپر سوار نہ ہونے دے بلکہ خود اس پر سوار ہو اور اسے اپنے اختیار سے چلا کر اس سیدھی شاہراہ پر سفر کرے جو منزلِ مقصود کی طرف جاتی ہے۔ اس غرض کے لیے صرف یہی بات کافی نہیں ہے کہ ڈرائیور کو راستہ کا علم، موٹر کا طریق استعمال اور مقصدِ استعمال، اور فی الجملہ ڈرائیوری کے اداب سکھا کر ایک مہذب اور تربیت یافتہ ڈرائیور بنا دیا جائے۔ بلکہ اس کی بھی ضرورت ہے کہ اسٹیرنگ، بریک اور ایکسلریٹر ہر وقت مضبوطی کے ساتھ کسے ہوئے رکھے جائیں اور ڈرائیور کی گرفت ان پر ڈھیلی نہ ہونے پائے، کیونکہ یہ منہ زور موٹر ہر وقت بے راہ رَوی کے لیے زور لگا رہی ہے۔

نماز میں دعاؤں اور تسبیحوں کے ساتھ اوقات کی پابندی، طہارت وغیرہ کی شرائط اور جسمانی حرکات کا جوڑ اسی لیے لگایا گیا ہے کہ ڈرائیور اپنی موٹر پر پوری طرح قابو یافتہ رہے اور اسے اپنے ارادے کے تحت چلانے میں مشاق ہو جائے۔ اس طریقہ سے موٹر کی منہ زوری روزانہ پانچ وقت توڑی جاتی ہے، بریک کسے جاتے ہیں، ایکسلریٹر اور اسٹیرنگ مضبوط کیے جاتے ہیں، اور ڈرائیور کی گرفت مستحکم کی جاتی ہے، صبح کا وقت ہے، نیند مزے سے آ رہی ہے، آرام طلب نفس کہتا ہے پڑے رہو، اب کہاں اُٹھ کر جاؤ گے۔ نماز کہتی ہے کہ وقت آ چکا ہے، سیدھی طرح اُٹھو، غسل کی حاجت ہے تو نہاؤ، ورنہ وضو کرو، جاڑے کا موسم ہے تو ہو کرے، پانی گرم نہیں ہے، نہ سہی، ٹھنڈے پانی سے ہی طہارت حاصل

کرو۔ اور چلو مسجد کی طرف۔ ان دو متضاد مطالبوں میں سے اگر آپ نے
نفس کے مطالبے کو پورا کر دیا تو موٹر آپ پر سوار ہو گئی۔ اگر نماز کے مطالبہ
کو پورا کیا تو آپ موٹر پر سوار ہو گئے۔ اسی طرح ظہر، عصر، مغرب، عشاء
ہر وقت نفس کسی نہ کسی مشغولیت، فائدے، نقصان، لطف، لذت، شدت
وغیرہ کے بہانے نکالتا ہے، موقع ڈھونڈتا رہتا ہے کہ ذرا آپ کے اندر
کمزوری پیدا ہو اور یہ آپ پر سوار ہو جائے۔ مگر نماز ہر رخ پر آپ کے
لیے تازیانہ بن کر آتی ہے۔ آپ کی اونگھتی ہوئی قوتِ ارادی کو جگاتی ہے،
اور آپ سے مطالبہ کرتی ہے کہ اپنی موٹر کو اپنے حکم کا تابع بناؤ، اس کے
غلام بن کر نہ رہ جاؤ۔ یہ معرکہ روز پیش آتا ہے۔ مختلف اوقات اور مختلف
حالتوں اور مختلف صورتوں میں پیش آتا ہے۔ کبھی سفر میں اور کبھی حضر میں،
کبھی گرمی میں اور کبھی جاڑے میں، کبھی آرام کے وقت اور کبھی کاروبار
کے وقت، کبھی تفریح کے موقع پر اور کبھی رنج و غم اور مصیبت کے
موقع پر۔ ان بے شمار مختلف متنوع حالتوں میں نفس کی طلب اور نماز
کی پکار کے مابین کشمکش ہوتی ہے، اور آپ آزمائش میں ڈالے جاتے
ہیں۔ نفس کی بات آپ نے مانی تو شکست کھا گئے۔ خادم آپ کا آقا
بن گیا۔ نہ جانے جاہل موٹر کے قابو میں آپ نے اپنے آپ کو دے ڈالا۔ اب
یہ ٹیڑھے ترچھے راستوں پر آپ کو لیے لیے پھرے گی اور آپ بے بسی کے عالم
میں اس کے ساتھ پھرتے رہیں گے۔ بخلاف اس کے اگر آپ نماز کا
مطالبہ پورا کرتے رہے تو آپ اس موٹر کا باغیانہ زور توڑ دیں گے، اس پر

حکمران بن جائیں گے اور آپ میں یہ طاقت پیدا ہو جائے گی کہ اپنے علم و اذعان اور اپنے ارادے کے مطابق اس کے کل پرزوں اور اس کی قوتوں سے کام لیں۔

اسی بنا پر قرآن نے نماز کے ضائع کرنے کا فوری اور لازمی نتیجہ یہ بیان کیا ہے کہ آدمی شہوات اور خواہشات کا تابع بن جاتا ہے اور سیدھے راستے سے ہٹ کر ٹیڑھے راستوں میں بھٹکتا چلا جاتا ہے۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا۔ (مریم ۔ ۵۹)	پھر ان کے بعد ایسے ناخلف لوگ آئے جنہوں نے نماز کو ضائع کیا اور خواہشات کے پیچھے پڑ گئے۔ لہذا عنقریب وہ کج راہی میں مبتلا ہوں گے۔

افراد کی تیاری کا پروگرام

یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے، یہ نماز کے فوائد و منافع کا صرف ایک پہلو ہے۔ یعنی یہ کہ نماز افراد کس طرح تیار کرتی ہے۔ اب دوسرے پہلو کی طرف توجہ کرنے سے پہلے فرد کی تیاری کے اس پروگرام پر مجموعی نظر ڈال لیجئے۔

اس پروگرام کے پانچ حصے ہیں:-

(۱) آدمی کے ذہن میں اس حقیقت کے ادراک کو تازہ رکھنا کہ وہ دُنیا میں ایک خود مختار وجود نہیں ہے بلکہ رب العالمین کا بندہ ہے اور یہاں اسی حیثیت سے اس کو کام کرنا ہے۔

(۲) بندہ کی حیثیت سے اس کو فرض شناس بنانا اور اس میں ادائے

فرض کی عادت پیدا کرنا۔

(۳) فرض شناس اور نافرض شناس میں تمیز کرنا اور نا فرض شناس افراد کو چھانٹ کر الگ کر دینا۔

(۴) خیالات کا ایک پورا نظام، ایک پوری آئیڈیالوجی آدمی کے ذہن میں اتار دینا اور اس کو ایسا مستحکم کرنا کہ ایک پختہ سیرت بن جائے۔

(۵) آدمی میں یہ قوت پیدا کرنا کہ اپنے عقیدے اور اپنے علم و بصیرت کے مطابق جس طرزِ عمل کو صحیح سمجھتا ہو اس پر عمل کر سکے، اور اپنے جسم و نفس کی تمام طاقتوں سے اُس راہ میں کام لے سکے۔ اس کے کیرکٹر میں اس قسم کا ڈھیلا پن نہ رہ جائے کہ صحیح تو سمجھتا ہو ایک طریقہ کو، مگر اپنے نفس کی خواہش سے مجبور ہو کر چلے دوسرے طریقہ پر۔

اسلام جو سوسائٹی بناتا ہے اس کے ایک ایک فرد کو وہ اس طرح نماز کے ذریعہ سے تیار کرتا ہے۔ دس برس کی عمر کے بعد اس سوسائٹی کے ہر لڑکے اور لڑکی پر نماز فرض کر دی گئی ہے۔ اور یہ فرض کسی حال میں اس سے ساقط نہیں ہوتا، اِلّا یہ کہ وہ اپنے ہوش و حواس میں نہ ہو یا عورت حیض و نفاس کی حالت میں ہو۔ بیماری میں، سفر میں، جنگ کے معرکے تک میں۔ یہ فرض اسے ادا کرنا پڑے گا۔ اُٹھ نہ سکے تو بیٹھ کر پڑھے، بیٹھنا ممکن نہ ہو، لیٹ کر پڑھے، ہاتھ پاؤں حرکت نہ کر سکتے ہوں، اشارے سے پڑھے، پانی نہ ملتا ہو، مٹی سے تیمّم کر کے پڑھے۔ قبلے کی سمت نہ معلوم ہو، جدھر گمان ہو اسی طرف منہ کر کے پڑھے۔ غرض کوئی

عذر اس معاملہ میں مسموع نہیں ہے۔ نماز کا وقت جب آجائے تو ہر
حال میں مسلمان مامور ہے کہ اس فرض کو ادا کرے۔

بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کے سوا دنیا میں کوئی دوسرا
اجتماعی نظام ایسا نہیں ہے جس نے اپنے اجزائے ترکیبی یعنی اپنے افراد
کو فرداً فرداً تیار کرنے کا ایسا مکمل انتظام کیا ہو۔ دنیا کے اجتماعی نظامات
میں جماعت (Community) کی ہیئت ترکیبی بنانے اور افراد کو بیرونی
بندشوں میں جکڑنے ہی پر تمام زور دیا جاتا ہے، مگر جماعت کے ایک ایک
جزو کو اندر سے تیار کرنے اور جماعتی اصولوں کے مطابق بننے کی کوشش
کم کی جاتی ہے۔ حالانکہ جماعت کی حیثیت ایک دیوار کی سی ہے جو
اینٹوں سے بنتی ہے، ایک ایک اینٹ اگر مضبوط نہ ہو تو دیوار بحیثیت
مجموعی کمزور ہوگی۔ اسی طرح افراد کی سیرت میں اگر کمزوری ہو، اگر
ان کے خیالات جماعتی اصولوں کے مطابق نہ ہوں، اور اگر عمداً وہ
جماعتی راہ سے منحرف چلنے کے لیے میلانات رکھتے ہوں تو محض بیرونی
بندشیں جماعت کے نظام کو زیادہ عرصے تک قائم نہیں رکھ سکتیں، آخرکار
بغاوت رونما ہوگی اور نظام ٹوٹ جائے گا۔

تنظیم جماعت

اب ہمیں نماز کے دوسرے پہلو پر نظر ڈالنی چاہیے۔
یہ ظاہر ہے کہ انفرادی سیرت تنہا کوئی نتیجہ پیدا نہیں کر
سکتی جب تک کہ جماعت (Community) میں بھی وہی سیرت موجود
نہ ہو۔ فرد اپنے نصب العین (Ideal) کو پا ہی نہیں سکتا جب تک کہ

وہ لوگ، جن کے درمیان وہ زندگی بسر کر رہا ہے، اس نصب العین تک پہنچنے میں اس کے ساتھ تعاون نہ کریں۔ فرد جن اصولوں پر ایمان رکھتا ہے، ان کے مطابق تنہا عمل کرنا اس کے لیے ناممکن ہے، تاوقتیکہ پوری جماعتی زندگی انہی اصولوں پر قائم نہ ہو جائے۔ آدمی دُنیا میں اکیلا پیدا نہیں ہوا ہے، نہ اکیلا رہ کر کوئی کام کر سکتا ہے، اس کی ساری زندگی اپنے بھائی بندوں، دوستوں اور ہمسایوں، معاملہ داروں اور زندگی کے بے شمار ساتھیوں کے ساتھ ہزاروں قسم کے تعلقات میں جکڑی ہوئی ہے۔ دُنیا میں وہ خُدا کی طرف سے مامور اسی پر کیا گیا ہے کہ اس اجتماعی زندگی اور ان اجتماعی تعلقات میں خُدا کے قانون کو جاری کرے۔ اس قانون پر عمل کرنے اور اس کو نافذ کرنے کا نام ہی عبادت ہے۔ اگر آدمی ایسے لوگوں کے درمیان گھِرا ہُوا ہو جو اس قانون کو مانتے ہی نہ ہوں، یا سب کے سب اس کی نافرمانی پر تلے ہوئے ہوں، یا ان کے باہمی تعلقات اس طرح کے ہوں کہ اس کو جاری کرنے میں وہ ایک دوسرے کی مدد کرنے کے لیے تیار نہ ہوں تو اکیلے آدمی کے لیے خود اپنی زندگی میں بھی اس پر عمل کرنا غیر ممکن ہے۔ کجا کہ وہ جماعتی زندگی میں اس کو نافذ کر سکے۔

علاوہ بریں مسلمان کے لیے یہ دُنیا سخت جدوجہد، مقابلہ اور کشمکش کا معرکۂ کارزار ہے۔ یہاں خُدا سے بغاوت کرنے والوں کے بڑے بڑے جتھے بنے ہوئے ہیں جو انسانی زندگی میں خود اپنے بنائے ہوئے قوانین کو پوری قوت کے ساتھ جاری کر رہے ہیں اور ان کے

مقابلہ میں مسلمان پر یہ ذمہ داری، بھاری، کمر توڑنے والی ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ یہاں خُدا کے قانون کو پھیلائے اور جاری کرے، انسان کے بنائے ہوئے قوانین جہاں جہاں چل رہے ہیں انہیں مٹائے اور ان کی جگہ اللّٰہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کے قانون کی حکومت قائم کرے۔ یہ زبردست خدمت جو مسلمان کے سپرد کی گئی ہے، اس کو باغی جتھوں کے مقابلہ میں کوئی اکیلا مسلمان انجام نہیں دے سکتا۔ اگر کروڑوں مسلمان بھی دُنیا میں موجود ہوں، مگر الگ الگ رہ کر انفرادی کوشش کریں، تب بھی وہ مخالفین کی منظم طاقت کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔ اس کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ سارے بندے جو خُدا کی عبادت کرنا چاہتے ہیں، ایک جتھا بنیں، ایک دوسرے کے مددگار ہوں، ایک دوسرے کی پشت پناہ بن جائیں اور مل کر اپنے مقصد کے لیے جدو جہد کریں۔

ان دونوں اغراض کے لیے مسلمانوں کا صرف مل جانا ہی کافی نہیں، بلکہ یہ ملنا صحیح طریق پر ہونا چاہیے۔ صرف اجتماعی نظام پیدا ہو جانا کافی نہیں بلکہ ایک صالح اجتماعی نظام درکار ہے جس میں مسلمان اور مسلمان کا تعلق ٹھیک ویسا ہی ہو جیسا کہ اسلام چاہتا ہے۔ ان کے درمیان مساوات ہو، محبت اور ہمدردی ہو، یک جہتی اور وحدت فی العمل (Unity in Action) ہو، سب کے اندر خُدا کی بندگی کرنے کا مشترک ارادہ نہ صرف موجود ہو، بلکہ پیہم متحرک رہے اور اجتماعی حرکت کرنے کی عادت ان کی طبیعت ثانیہ بن جائے۔ ان میں سے ہر

ایک یہ جانتا ہو کہ جب وہ لیڈر بنے تو جماعت میں اس کا رویّہ کیا ہونا چاہیئے اور جب کوئی دوسرا ان کا لیڈر ہو تو وہ کس طرح ان کی اطاعت کریں۔ کس طرح اس کے حکم پر حرکت کریں، کہاں تک کہ اس کی فرمانبرداری اُن پر واجب ہے، کہاں انہیں اس کو ٹوکنا چاہیئے، اور کس حد پر پہنچ کر وہ ان کی اطاعت کا مستحق نہیں رہتا۔

نماز با جماعت نماز انفرادی سیرت کی تعمیر کے ساتھ یہ کام بھی کرتی ہے۔ وہ اس اجتماعی نظام کا پورا ڈھانچہ بناتی ہے، اس کو قائم کرتی اور قائم رکھتی ہے۔ اور اسے روزانہ پانچ مرتبہ حرکت میں لاتی ہے تاکہ وہ ایک مشین کی طرح چلتا رہے۔ اسی لیے پنجوقتہ نماز کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ شریعت کی رو سے ایک ایک شخص الگ الگ نماز پڑھ کر فرض سے سبکدوش تو ہو سکتا ہے، مگر وہ گنہگار ہوگا اگر قصداً بلا عذر مسجد میں حاضر ہو کر جماعت کے ساتھ نماز نہ پڑھے۔

جماعت کی اس تاکید کا مقصد یہی ہے کہ مسلمانوں کا نظام اجتماعی اپنی صحیح صورت پر قائم اور متحرک رہے۔ مسجد کا پنجوقتہ اجتماع مسلمانوں کے نظامِ اجتماعی کی بنیاد ہے۔ اس بنیاد کی مضبوطی پر اس پورے نظام کی مضبوطی منحصر ہے۔ اِدھر یہ کمزور ہوئی اور اُدھر سارا شیرازہ بکھر کر رہ جاتا ہے۔

اذان حکم ہے کہ اذان کی آواز سنتے ہی اُٹھ جاؤ اور اپنے اپنے کام

چھوڑ کر مسجد کی طرف رُخ کرو۔ اس طلبی کی پکار سُن کر ہر طرف سے مسلمانوں کا ایک مرکز کی طرف دوڑنا وہی کیفیت اپنے اندر رکھتا ہے جو فوج کی ہوتی ہے۔ فوج کے سپاہی جہاں جہاں بھی ہوں، بگل کی آواز سنتے ہی سمجھ لیتے ہیں کہ ہمارا کمانڈر ہمیں بلا رہا ہے۔ اس طلبی پر سب کے دل میں ایک ہی کیفیت پیدا ہوتی ہے یعنی کمانڈر کے حکم کی پیروی کا خیال، اور اس خیال کے آتے ہی سب ایک ہی کام کرتے ہیں۔ یعنی اپنے اپنے کام چھوڑ کر اُٹھنا اور ہر طرف سے سمٹ کر ایک ہی جگہ جمع ہو جانا۔ فوج میں یہ طریقہ کس لیے رکھا گیا ہے؟ اس لیے کہ اوّل تو ہر ہر سپاہی میں فوراً فوراً حکم ماننے اور اس مستعدی کے ساتھ عمل کرنے کی خصلت و عادات پیدا ہو، اور اس کے ساتھ ہی ایسے تمام فرمانبردار سپاہی مل کر ایک گروہ، ایک جتھا، ایک ٹیم بن جائیں اور ان میں یہ عادت پیدا ہو جائے کہ کمانڈر کا حکم پاتے ہی ایک وقت میں ایک جگہ سب مجتمع ہو جایا کریں تاکہ جب کوئی مہم پیش آئے تو ساری فوج ایک آواز میں ایک مقصد کے لیے اکٹھی ہو کر کام کر سکے۔ فوجی اصطلاح میں اس کو سرعتِ اجتماع (Mobility) کہتے ہیں اور یہ فوجی زندگی کی جان ہے۔ اگر کسی فوج میں اس طرح مجتمع ہونے کی صلاحیت نہ ہو، اور اس کے سپاہی ایسے خودسر ہوں کہ جس کا جدھر منہ اُٹھتا ہو اُدھر چلا جاتا ہو، تو خواہ ایسی فوج کا ایک ایک سپاہی تیس مارخاں ہی کیوں نہ ہو وہ کسی مہم کو سر نہیں کر سکتی۔ اس قسم کے ایک ہزار بہادر سپاہیوں کو دشمن کے پچاس سپاہیوں کا ایک منظم دستہ

الگ الگ پکڑ کر ختم کر سکتا ہے۔ ٹھیک اسی مصلحت کی بنا پر مسلمانوں کے لیے بھی یہ قاعدہ مقرر کر دیا گیا ہے کہ جو مسلمان جہاں بھی اذان کی آواز سُنے، سب کام چھوڑ کر اپنے قریب کی مسجد کا رُخ کرے۔ اس اجتماع کی مشق ان کو روزانہ پانچ وقت کرائی جاتی ہے، کیونکہ اس خُدائی فوج کی ڈیوٹی دُنیا کی ساری فوجوں سے زیادہ سخت ہے، جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ دوسری فوجوں کے لیے تو مدتوں میں کبھی ایک مہم پیش آتی ہے اور اس کی خاطر ان کو یہ ساری فوجی مشقیں کرائی جاتی ہیں، مگر اس خدائی فوج کو تو ہر وقت ایک مہم درپیش ہے۔ اس لیے اس کے ساتھ یہ بھی بہت بڑی رعایت ہے کہ اسے دن رات میں صرف پانچ مرتبہ ہی خُدائی بگل کی آواز پر دوڑنے اور خُدائی چھاؤنی، یعنی مسجد میں جمع ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔

مسجد میں اجتماع

یہ محض اذان کا فائدہ تھا۔ اب آپ مسجد میں جمع ہوتے ہیں اور صرف جمع ہونے ہی میں بے شمار فائدے ہیں۔ یہاں جو آپ نے ایک دوسرے کو دیکھا، پہچانا، ایک دوسرے سے واقف ہوئے، یہ دیکھنا، پہچاننا، واقف ہونا کس حیثیت سے ہے؟ اس حیثیت سے کہ آپ سب خُدا کے بندے ہیں، ایک رسُولؐ کے پیرو ہیں، ایک کتاب کے ماننے والے ہیں، ایک ہی مقصد سب کی زندگی کا ہے، اسی مقصد کے لیے آپ مسجد میں جمع ہوئے ہیں اور اسی مقصد کے لیے مسجد سے باہر جا کر بھی آپ کو عمل کرنا ہے۔ اس قسم

تعارف آپ میں خود بخود یہ خیال پیدا کر دیتا ہے کہ آپ سب ایک قوم ہیں، ایک ہی فوج کے سپاہی ہیں، ایک دوسرے کے بھائی اور رفیق ہیں، دُنیا میں آپ کی اغراض، آپ کے مقاصد، آپ کے نقصانات اور آپ کے فوائد سب مشترک ہیں، آپ کی زندگیاں ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اٹھیں گے تو ایک ساتھ اور گریں تو ایک ساتھ۔

پھر آپ جو ایک دوسرے کو دیکھیں گے تو ظاہر ہے کہ آنکھیں کھول کر دیکھیں گے اور یہ دیکھنا بھی دشمن کو دیکھنا نہیں بلکہ دوست کا دوست کو اور بھائی کا بھائی کو دیکھنا ہوگا۔ اس نظر سے جب آپ دیکھیں گے کہ میرا کوئی بھائی پھٹے پرانے کپڑوں میں ہے، کوئی پریشان صورت ہے، کوئی فاقہ زدہ چہرہ لیے ہوئے آیا ہے، کوئی معذور، لنگڑا، لولا، اندھا ہے تو خواہ مخواہ آپ کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوگا۔ آپ میں سے جو خوشحال ہیں، وہ غریبوں اور بیکسوں پر رحم کھائیں گے۔ جو بدحال ہیں انہیں امیروں تک پہنچنے اور اپنا حال کہنے کی ہمت ہوگی۔ کسی کے متعلق معلوم ہوگا کہ بیمار ہے یا کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے اس لیے مسجد میں نہیں آیا تو آپ اس کی عیادت کو جائیں گے۔ کسی کے مرنے کی خبر ملی تو آپ اس کے جنازے میں شریک ہوں گے اور غم زدہ عزیزوں کو تسلی دیں گے۔ یہ سب باتیں آپس کی محبت کو بڑھانے والی، آپ کو ایک دوسرے کے قریب کرنے والی اور ایک دوسرے کا مددگار بنانے والی ہیں۔

اور ذرا غور کیجیے، یہاں جو آپ جمع ہوئے ہیں تو ایک جگہ پاک مقصد کے لیے جمع ہوئے ہیں، آپ کو کسی فلم سٹار کا عشق یہاں کھینچ کر نہیں لایا ہے۔ آپ شراب خوری یا جوئے بازی کے لیے جمع نہیں ہوئے ہیں۔ یہ بدکاروں کا اجتماع نہیں ہے کہ سب کے دل میں ناپاک خواہشیں اور نیتیں بھری ہوئی ہوں۔ یہ تو اللہ کے بندوں کا اجتماع ہے۔ اللہ کی عبادت کے لیے اللہ کے گھر میں سب اپنے خدا کے سامنے بندگی کا اقرار کرنے حاضر ہوئے ہیں۔ ایسے موقع پر اوّل تو ایمان دار آدمی کے دل میں خود ہی اپنے گناہوں پر شرمندگی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن اگر اس نے کوئی گناہ اپنے دوسرے بھائی کے سامنے کیا تھا۔ اور وہ بھی یہاں مسجد میں موجود ہے، تو محض اس کی نگاہوں کا سامنا ہو جانا ہی کافی ہے کہ گناہ گار اپنے دل میں کٹ کٹ جائے اور اگر کہیں مسلمانوں میں ایک دوسرے کو نصیحت کرنے کا جذبہ بھی موجود ہو اور وہ جانتے ہوں کہ ہمدردی و محبت کے ساتھ ایک دوسرے کی اصلاح کس طرح کرنی چاہیئے تو یقین جانیے کہ یہ اجتماع انتہائی رحمت و برکت کا موجب ہوگا۔ اس طرح سب مسلمان مل کر ایک دوسرے کی خرابیوں کو دور کریں گے، ایک دوسرے کے نقائص کی اصلاح کریں گے اور پوری جماعت صالحین کی جماعت بنتی چلی جائے گی۔

صف بندی یہ صرف مسجد میں جمع ہونے کی برکتیں ہیں۔ اب دیکھیے کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے میں کتنی برکات

پوشیدہ ہیں۔

سب مسلمان مسجد میں مساوی الحیثیت ہیں۔ ایک چمار اگر پہلے آیا ہو تو وہ اگلی صف میں ہوگا۔ اور ایک رئیس اگر بعد میں آئے تو وہ پچھلی صفوں میں رہے گا۔ کوئی بڑے سے بڑا آدمی مسجد میں اپنی سیٹ ریزرو نہیں کرا سکتا۔ کسی شخص کو یہ حق نہیں کہ دوسرے مسلمان کو مسجد میں کسی جگہ کھڑے ہونے سے روک دے یا جہاں وہ پہلے سے موجود ہو وہاں سے اس کو ہٹا دے۔ کوئی اس کا مجاز نہیں کہ آدمیوں پر سے پھاند کر یا صفوں کو چیر کر آگے پہنچنے کی کوشش کرے۔ سب مسلمان ایک صف میں ایک دوسرے کے برابر کھڑے ہوں گے، وہاں نہ کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا، نہ کوئی اونچ ہے نہ نیچ۔ نہ کسی کے چھو جانے سے کوئی ناپاک ہو جاتا ہے، نہ کسی کے برابر کھڑا ہونے سے کسی کی عزت کو بٹہ لگتا ہے۔ بازار کا جاروب کش آئے گا اور گورنر کے برابر کھڑا ہو جائے گا۔ یہ وہ اجتماعی جمہوریت (Social Democracy) ہے۔ جسے قائم کرنے میں اسلام کے سوا کوئی کامیاب نہیں ہو سکا۔ یہاں روزانہ پانچ وقت سوسائٹی کے افراد کی اونچ نیچ برابر کی جاتی ہے، بڑوں کے دماغ سے کبریائی کا غرور نکالا جاتا ہے۔ چھوٹوں کے ذہن سے پستی کا احساس دور کیا جاتا ہے اور سب کو یہ یاد دلایا جاتا ہے کہ خدا کی نگاہ میں تم سب انسان یکساں ہو۔

یہ صف بندی جس طرح طبقاتی امتیازات کو مٹاتی ہے اسی طرح

نسل، قبیلہ، وطن اور رنگ وغیرہ کی عصبیتوں کو بھی مٹاتی ہے۔ مسجد میں کسی امتیازی نشان کے لحاظ سے مختلف انسانی گروہوں کے بلاک الگ نہیں ہوتے۔ تمام مسلمان جو مسجد میں آئیں، خواہ وہ کالے ہوں یا گورے، ایشیائی ہوں یا فرنگی، سامی ہوں یا آرین اور ان کے قبیلوں اور ان کی زبانوں میں خواہ کتنے ہی اختلافات ہوں، بہرحال سب کے سب ایک صف میں کھڑے ہو کر نماز ادا کرتے ہیں۔ روزانہ پانچ وقت اس نوع کا اجتماع ان تعصبات کی بیخ کنی کرتا رہتا ہے جو انسانی جماعت میں خارجی اختلافات کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں۔ یہ انسانی وحدت قائم کرتا ہے، بین الاقوامیت کی جڑیں مضبوط کرتا ہے اور اس خیال کو دماغوں میں پیوست کر دیتا ہے کہ حسب وغیرہ نسب اور برادریوں کی ساری عصبیتیں جھوٹی ہیں، تمام انسان خدا کے بندے ہیں اور اگر خدا کی بندگی و عبادت پر وہ سب متفق ہو جائیں تو پھر وہ سب ایک اُمت ہیں۔

پھر جب یہ ایک صف میں کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوتے ہیں اور ایک ساتھ رکوع و سجدہ کرتے ہیں تو ان کے اندر منظم اجتماعی حرکت کرنے کی وہ صلاحیتیں پرورش پاتی ہیں جنھیں پیدا کرنے کے لیے فوج کو پریڈ کرائی جاتی ہے۔ اس کا مدعا ہی یہ ہے کہ مسلمانوں میں یک جہتی اور وحدت فی العمل پیدا ہو اور خدا کی بندگی میں ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر تنِ واحد کی طرح ہو جائیں۔

اجتماعی دعائیں صف بندی کے ان تمام فائدوں کو وہ دعائیں دو آتشہ کر دیتی ہیں، جو نماز میں خدا سے مانگی جاتی ہیں سب یک زبان ہو کر اپنے مالک سے عرض کرتے ہیں کہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ۔ ہم سب تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" ہم سب کو سیدھے راستے کی ہدایت دے۔" اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ" ہم پر سلامتی ہو اور اللہ کے نیک بندوں پر بھی۔" نماز کی دعاؤں میں کہیں آپ کو واحد کا صیغہ نہ ملے گا، جہاں آپ دیکھیں گے جمع ہی کا صیغہ پائیں گے۔ اجتماعی عبادت اور اجتماعی حرکات کے ساتھ مل کر یہ اجتماعی دعائیں ہر مسلمان کے ذہن میں یہ نقش ثبت کر دیتی ہیں اور روزانہ ثبت کرتی رہتی ہیں کہ وہ اکیلا نہیں ہے۔ اسے سب کچھ تنہا اپنے ہی لیے چاہنا اور مانگنا نہیں ہے، بلکہ اس کی زندگی جماعت کے ساتھ مربوط ہے، جماعت کی بھلائی میں اس کی بھلائی ہے۔ جماعت ہی کی راہِ راست پر چلنے میں اس کی خیر ہے۔ خدا کی طرف سے فضل اور سلامتی جماعت پر نازل ہوگی، تب ہی وہ خود بھی اس سے متمتع ہو سکے گا۔ یہ چیز دماغوں سے انفرادیت (Individualism) کو نکالتی ہے، اجتماعی ذہنیت (Social Mindedness) پیدا کرتی ہے، افرادِ جماعت میں خیر خواہی کے جذبات اور مخلصانہ محبت کے روابط کو نشو و نما دیتی ہے، اور روزانہ پانچ مرتبہ اس طریقہ سے مسلمانوں کے احساس

اجتماعیت کو اکسایا جاتا ہے تاکہ مسجد کے باہر زندگی کے وسیع میدان میں ان کا برتاؤ درست رہے۔

امامت

یہ اجتماعی عبادت ایک امام (Leader) کے بغیر انجام نہیں پاتی۔ دو آدمی بھی اگر فرض نماز نہ پڑھیں تو لازم ہے کہ ان میں سے ایک امام بنے اور دوسرا مقتدی (Follower) جماعت جب کھڑی ہو جائے تو اس سے الگ نماز پڑھنا سخت ممنوع ہے۔ بلکہ ایسی نماز ہوتی ہی نہیں۔ حکم ہے کہ جو آتا جائے اسی امام کے پیچھے جماعت میں شامل ہوتا جائے۔ امامت کا منصب کسی طبقہ یا کسی نسل یا گروہ کے ساتھ مخصوص نہیں نہ اس کے لیے کوئی ڈگری یا سند درکار ہے۔ ہر مسلمان امام بن سکتا ہے۔ البتہ شریعت یہ سفارش کرتی ہے کہ امام بنانے میں آدمی کی چند صفات کا لحاظ کیا جائے جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

جماعت میں امام اور مقتدیوں کا تعلق جس طور پر قائم کیا گیا ہے اس میں ایک ایک چیز انتہا درجہ کی معنیٰ خیز ہے۔ اس میں دراصل ہر مسلمان کو قیادت (Leadership) اور اتباعِ قیادت (Followership) کی مکمل ٹریننگ دی جاتی ہے۔ اس میں بتایا جاتا ہے کہ اس چھوٹی مسجد سے باہر اس وسیع مسجد میں جس کا نام زمین ہے، مسلمانوں کا جماعتی نظام کیسا ہونا چاہیے، جماعت میں امام کی کیا حیثیت ہے، اس کے فرائض کیا ہیں، اس کے حقوق کیا ہیں اور امام بننے کی صورت میں اس کا طرزِ عمل کیسا ہونا چاہیے۔ دوسری طرف

جماعت کو اس کی اطاعت کس طرح کرنی چاہیے اور کن باتوں میں کرنی چاہیئے۔ اگر وہ غلطی کرے تو مسلمان کیا کریں، کہاں تک غلطی میں بھی اس کی پیروی کریں، کہاں وہ اس کو ٹوکنے کے مجاز ہیں، کہاں ان کو اس سے یہ مطالبہ کرنے کا حق حاصل ہے کہ اپنی غلطی کی اصلاح کرے۔ اور کس موقع پر وہ اس کو امامت سے ہٹا سکتے ہیں۔ یہ سب گویا چھوٹے پیمانہ پر ایک بڑی سلطنت کو چلانے کی مشق ہے۔ جو ہر روز پانچ مرتبہ ہر چھوٹی سے چھوٹی مسجد میں کرائی جاتی ہے۔

ہدایت کی گئی کہ امام ایسے شخص کو منتخب کیا جانے، جو پرہیزگار ہو، نیک سیرت ہو، دین کا علم رکھتا ہو اور سن رسیدہ ہو۔ حدیث میں ترتیب بھی بتا دی گئی ہے کہ ان صفات میں سے کونسی صفت کس صفت پر مقدم ہے۔ یہیں سے یہ تعلیم بھی دی گئی کہ سردار قوم کے انتخاب میں کن چیزوں کا لحاظ کرنا چاہیئے۔

حکم ہے کہ امام ایسے شخص کو نہ بنایا جائے جس سے جماعت کی اکثریت ناراض ہو۔ یوں تھوڑے بہت مخالف کس کے نہیں ہوتے۔ لیکن اگر جماعت میں زیادہ تر آدمی کسی شخص کی اقتداء کرنے سے کراہت کرتے ہوں تو اسے امام نہ بنایا جائے۔ یہاں بھی سردار قوم کے انتخاب کا ایک قاعدہ بتا دیا گیا۔ ایک بری شہرت کا آدمی جس کی بد سیرتی و بد کرداری سے عام لوگ نفرت کرتے ہوں، اس قابل نہیں ہو سکتا کہ مسلمانوں کا امیر بنایا جائے۔

حکم ہے کہ جو شخص امام بنے وہ نماز پڑھانے میں جماعت کے ضعیف لوگوں کا بھی لحاظ رکھے۔ محض جوان، مضبوط، تندرست، اور فرصت والے آدمیوں ہی کو پیش نظر رکھ کر لمبی لمبی قرأت اور لمبے لمبے رکوع اور سجدے نہ کرنے لگے، بلکہ یہ بھی خیال رکھے کہ جماعت میں بوڑھے بھی ہیں، بیمار بھی ہیں، کمزور بھی ہیں، اور ایسے مشغول آدمی بھی ہیں جو اپنا کام چھوڑ کر نماز کے لیے آئے ہیں اور جن کو نماز سے پھر اپنے کام کی طرف واپس جانا ہے۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلّم نے اس معاملہ میں، یہاں تک رحم اور شفقت کا نمونہ پیش فرمایا ہے کہ نماز پڑھانے میں اگر کسی بچّے کے رونے کی آواز آ جاتی تو آپ نماز مختصر کر دیتے تھے۔ تاکہ گر بچّے کی ماں جماعت میں شامل ہو تو اسے تکلیف نہ ہو۔ یہ گویا سردار قوم کو تعلیم دی گئی ہے کہ جب وہ سردار بنایا جائے تو جماعت میں اس کا طرزِ عمل کیسا ہونا چاہیئے۔

حکم ہے کہ اگر نماز پڑھانے کے دوران میں امام کو کوئی حادثہ پیش آ جائے جس کی وجہ سے وہ نماز پڑھانے کے قابل نہ رہے تو فوراً ہٹ جائے اور اپنی جگہ پیچھے کے آدمی کو کھڑا کر دے۔ یہاں پھر سردار قوم کے لیے ایک ہدایت ہے۔ اس کا بھی یہی فرض ہے کہ جب وہ اپنے آپ کو سرداری کے قابل نہ پائے تو خود ہٹ جائے اور دوسرے اہل آدمی کے لیے جگہ خالی کر دے۔ اس میں نہ شرم کا کچھ کام ہے اور نہ خودغرضی کا۔

حکم ہے کہ امام کے فعل کی سختی کے ساتھ پابندی کرنی چاہیئے۔ اس

کی حرکت سے پہلے حرکت کرنا سخت ممنوع ہے، حتیٰ کہ جو شخص امام سے پہلے رکوع یا سجدے میں جائے اس کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے روز وہ گدھے کی صورت میں اٹھایا جائے گا۔ یہاں قوم کو سبق دیا گیا ہے کہ اسے سردار کی اطاعت کس طرح کرنی چاہیے۔

امام اگر نماز میں غلطی کرے، مثلاً جہاں اسے بیٹھنا چاہیئے تھا وہاں کھڑا ہو جائے یا جہاں کھڑا ہونا چاہیئے تھا وہاں بیٹھ جائے تو حکم ہے سبحان اللہ کہہ کر اسے غلطی سے متنبہ کرو۔ سبحان اللہ کے معنی ہیں "اللہ پاک ہے"۔ امام کی غلطی پر سبحان اللہ کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ خطا سے پاک تو بس اللہ ہی کی ذات ہے، تم انسان ہو، تم سے بھول چوک ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہ طریقہ ہے امام کو ٹوکنے کا۔

اور جب اس طرح امام کو ٹوکا جائے تو اس کو لازم ہے کہ بلا کسی شرم ولحاظ کے اپنی غلطی کی اصلاح کرے اور صرف اصلاح ہی نہ کرے بلکہ نماز ختم کرنے سے پہلے اللہ کے سامنے اپنے قصور کے اعتراف میں دو مرتبہ سجدہ بھی کرے۔ البتہ اگر ٹوکے جانے کے باوجود امام کو اس امر پر پورا یقین ہو کہ اس مقام پر اسے کھڑا ہی ہونا چاہیئے تھا، یا بیٹھنا چاہیئے تھا، تو وہ اپنے وثوق کے مطابق عمل کر سکتا ہے۔ اس صورت میں جماعت کا کام یہ ہے کہ وہ امام کا ساتھ دے، اگرچہ وہ اپنی جگہ اس امر کا یقین واثق ہی کیوں نہ رکھتی ہو کہ امام غلطی کر رہا ہے۔ نماز ختم ہو جانے کے بعد مقتدیوں کو حق ہے کہ امام پر اس کی غلطی ثابت کریں

اور اس سے مطالبہ کریں کہ دوبارہ نماز پڑھائے۔

امام کے ساتھ جماعت کا یہ طرزِ عمل تو صرف ان غلطیوں کے بارے میں ہے جو معمولی جزئیات سے تعلق رکھتی ہوں۔ لیکن اگر امام سنتِ نبوی کے خلاف نماز کی ہیئت اور ترکیب بدل دے، یا قرآن کو تحریف کرکے پڑھے، یا نماز کے پڑھانے کے دوران میں کفر و شرک یا صریح معصیت کا ارتکاب کرے، یا کوئی ایسا فعل کرے جس سے معلوم ہو کہ یا تو وہ قانونِ الٰہی کی پیروی سے منحرف ہو گیا ہے، یا اس کی عقل میں فتور آ گیا ہے تو جماعت کا فرض ہے کہ نماز توڑ کر اس سے الگ ہو جائے اور اسے ہٹا کر کسی دوسرے شخص کو اس کی جگہ قائم کرے۔ پہلی صورت میں امام کی پیروی نہ کرنا جتنا بڑا گناہ ہے، دوسری صورت میں اس کی پیروی کرنا اس سے بھی بڑا گناہ ہے۔

بعینہٖ یہی صورت بڑے پیمانہ پر قوم اور اس کے سردار کے تعلق کی بھی ہے۔ جب تک سردار اسلامی کانسٹی ٹیوشن کے اندر کام کر رہا ہے اس کی اطاعت مسلمانوں پر واجب ہے۔ نافرمانی کریں گے تو گنہگار ہوں گے۔ زیادہ سے زیادہ اسے ٹوک سکتے ہیں۔ لیکن اگر ان کے ٹوکنے پر بھی وہ فروعی معاملات میں غلطیاں کرے تو انہیں اس کی اطاعت پر قائم رہنا چاہیئے۔ مگر جب وہ اسلامی کانسٹی ٹیوشن کی حدود سے نکل رہا ہو تو پھر وہ مسلمانوں کی جماعت کا امیر نہیں رہ سکتا۔

یہاں تک نماز کے مقاصد اور اس کے اثرات کی جو تشریح کی گئی ہے

اگرچہ وہ اس کے تمام پہلوؤں پر حاوی نہیں ہے تاہم اس سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ سکتی ہے کہ اس کو اسلام کا رُکنِ اعظم کیوں قرار دیا گیا ہے۔ رکن ستون کو کہتے ہیں جس کے سہارے پر عمارت قائم ہوتی ہے۔ اسلامی زندگی کی عمارت کو قائم ہونے اور قائم رہنے کے لیے جن سہاروں کی ضرورت ہے، ان میں سب سے مقدم سہارا یہ ہے کہ مسلمانوں کے افراد میں فرداً فرداً اور ان کی جماعت میں بحیثیتِ مجموعی وہ اوصاف پیدا ہوں جو خدا کی بندگی کا حق ادا کرنے اور دُنیا میں خلافتِ الٰہی کا بار سنبھالنے کے لیے ضروری ہیں۔ وہ غیب پر سچا اور زندہ ایمان رکھنے والے ہوں، وہ اللہ کو اپنا واحد فرمانروا تسلیم کریں اور اس کے فرض شناس اور اطاعت کیش بندے ہوں، اسلام کا نظامِ فکر و نظریۂ حیات ان کی رگ رگ میں ایسا پیوستہ ہو جائے کہ اسی کی بنیاد پر ان میں ایک پختہ سیرت پیدا ہو۔ اور ان کا عملی کردار اسی کے مطابق ڈھل جائے۔ اپنی جسمانی اور نفسانی قوتوں پر وہ اتنے قابو یافتہ ہوں کہ اپنے ایمان و اعتقاد کے مطابق ان سے کام لے سکیں۔ ان کے اندر منافقین کی جماعت اگر پیدا ہو گئی ہو یا باہر سے گھس آئی ہو تو وہ اہلِ ایمان سے الگ ہو جائے۔ ان کی جماعت کا نظام اسلام کے اجتماعی اصولوں پر قائم ہو، اور ایک مشین کی طرح پیہم متحرک رہے۔ ان میں اجتماعی ذہنیت کارفرما ہو۔ ان کے درمیان محبت ہو، ہمدردی ہو، تعاون ہو، مساوات ہو، وحدتِ

روح اور وحدتِ عمل ہو، وہ قیادت اور اقتداء کے حدود کو جانتے اور سمجھتے ہوں اور پورے نظم و ضبط کے ساتھ کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ یہ تمام مقاصد چونکہ نماز کی اقامت سے حاصل ہوتے ہیں لہٰذا اس کو دینِ اسلام کا ستون قرار دیا گیا۔ یہ ستون اگر منہدم ہو جائے تو مسلمانوں کی انفرادی سیرت اور اجتماعی ہیئت دونوں مسخ ہو کر رہ جائیں اور وہ اس مقصدِ عظیم کے لیے کام کرنے کے اہل ہی نہ رہیں جس کی خاطر جماعت وجود میں آئی ہے۔ اسی بنا پر فرمایا گیا کہ نماز عمادالدین ہے۔ یعنی دین کا سہارا ہے۔ جس نے اس کو گرایا اس نے دین کو گرا دیا۔

روزہ

ان مقاصد کی اہمیت اسلام میں اتنی زیادہ ہے کہ ان کو حاصل کرنے کے لیے صرف نماز کو کافی نہ سمجھا گیا بلکہ اس رکن کو مزید تقویت پہنچانے کے لیے ایک دوسرے رکن روزہ کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ نماز کی طرح یہ روزہ بھی قدیم ترین زمانہ سے اسلام کا رُکن رہا ہے۔ اگرچہ تفصیلی احکام کے لحاظ سے اس کی شکلیں مختلف رہی ہیں مگر جہاں تک نفسِ روزہ کا تعلق ہے وہ ہمیشہ الٰہی شریعتوں کا جزو لاینفک ہی رہا۔ تمام انبیاء علیہم السلام کے مذہب میں یہ فرض کی حیثیت سے شامل تھا۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ[1] اس سے یہ بات خود بخود مترشح ہوتی ہے کہ اسلام کی فطرت کے ساتھ اس طریقِ تربیت کو ضرور کوئی مناسبت ہے۔

زکوٰۃ اور حج کی طرح روزہ ایک مستقل جُداگانہ نوعیت رکھنے والا رکن نہیں ہے بلکہ در اصل اس کا مزاج قریب قریب وہی ہے جو رکنِ صلوٰۃ کا ہے اور اسے رکنِ صلوٰۃ کے مددگار اور معاون ہی کی

---

[1] تم پر روزے فرض کر دیے گئے، جس طرح تم سے پہلے انبیاء کے پیرودں پر فرض کیے گئے تھے۔ (البقرہ: ۱۸۳)

حیثیت سے لگایا گیا ہے۔ اس کا کام انہی اثرات کو زیادہ تیز اور زیادہ مستحکم کرنا ہے جو نماز سے انسانی زندگی پر مترتب ہوتے ہیں۔ نماز روزمرہ کا معمولی نظامِ تربیت ہے جو روز پانچ وقت تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے آدمی کو اپنے اثر میں لیتا ہے۔ اور تعلیم و تربیت کی ہلکی ہلکی خوراکیں دے کر چھوڑ دیتا ہے اور روزہ سال بھر میں ایک مہینہ کا غیر معمولی نظام تربیت (Special Training Course) ہے جو آدمی کو تقریباً ۷۲۰ گھنٹہ تک مسلسل اپنے مضبوط ڈسپلن کے شکنجہ میں کسے رکھتا ہے تاکہ روزانہ کی معمولی تربیت میں جو اثرات خفیف تھے وہ شدید ہو جائیں۔ یہ غیر معمولی نظامِ تربیت کس طرح اپنا کام کرتا ہے، اور کس کس ڈھنگ سے نفسِ انسانی پر مطلوبہ اثر ڈالتا ہے، اس کا تفصیلی جائزہ ہم ان صفحات میں لینا چاہتے ہیں۔

روزے کے اثرات

روزے کا قانون یہ ہے کہ آخر شب طلوع سحر کی پہلی علامات ظاہر ہوتے ہی آدمی پر یکایک کھانا پینا اور مباشرت کرنا حرام ہو جاتا ہے اور غروب آفتاب تک پورے دن حرام رہتا ہے۔ اس دوران میں پانی کا ایک قطرہ اور خوراک کا ایک ریزہ تک قصداً حلق سے اتارنے کی اجازت نہیں ہوتی اور زوجین کے لیے ایک دوسرے سے قضائے شہوت کرنا بھی حرام ہوتا ہے۔ پھر شام کو ایک خاص وقت آتے ہی اچانک حرمت کا بند ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ سب چیزیں جو ایک لمحہ پہلے تک حرام تھیں یکایک حلال ہو جاتی ہیں اور رات بھر حلال

رہتی ہیں ، یہاں تک کہ دوسرے روز کی مقررہ ساعت آتے ہی پھر حرمت کا قفل لگ جاتا ہے ۔ ماہِ رمضان کی پہلی تاریخ سے یہ عمل شروع ہوتا ہے اور ایک مہینہ تک مسلسل اس کی تکرار جاری رہتی ہے ۔ گویا پورے تیس دن آدمی ایک شدید ڈسپلن کے ماتحت رکھا جاتا ہے ۔ مقرر وقت تک سحری کرے ، مقرر وقت پر افطار کرے ، جب تک اجازت ، اپنی خواہشاتِ نفس پوری کرتا رہے اور جب اجازت سلب کر لی جائے تو ہر اُس چیز سے رُک جائے جس سے منع کیا گیا ہے ۔

احساسِ بندگی

اس نظامِ تربیت پر غور کرنے سے جو بات سب سے پہلے نظر میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام اس طریقہ سے انسان کے شعور میں اللہ کی حاکمیت کے اقرار و اعتراف کو مستحکم کرنا چاہتا ہے ، اور اس شعور کو اتنا طاقتور بنا دینا چاہتا ہے کہ انسان اپنی آزادی اور خود مختاری کو اللہ کے آگے بالفعل تسلیم (Surrender) کر دے ۔ یہ اعتراف و تسلیم ہی اسلام کی جان ہے ۔ اور اسی پر آدمی کے مسلم ہونے یا نہ ہونے کا مدار ہے ۔ دین اسلام کا مطالبہ انسان سے صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ بس وہ خداوندِ عالم کے وجود کو مان لے ، یا محض ایک مابعد الطبیعی نظریہ کی حیثیت سے اس بات کا اعتراف کر لے کہ اس کائنات کے نظام کو بنانے اور چلانے والا صرف اللہ واحد قہار ہے بلکہ اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ آدمی اس امرِ واقعی کو ماننے کے ساتھ ہی اس کے منطقی اور فطری نتیجہ کو بھی قبول کرے ۔ یعنی جب وہ یہ

مانتا ہے کہ اس کا اور تمام دُنیا کا خالق، پروردگار، قیام بخش اور مدبّر امر صرف اللہ تعالیٰ ہے اور جب وہ تسلیم کرتا ہے کہ نہ تخلیق میں کوئی اللہ کا شریک ہے، نہ پرورش میں، نہ قیام بخشی میں اور نہ تدبیر امر میں، تو اس تسلیم و اعتراف کے ساتھ ہی اسے اللہ کی حاکمیت و فرمانروائی کے آگے سپر ڈال دینی چاہیئے، اپنی آزادی و خود مختاری کے غلط ادعا سے خیال اور عمل دونوں میں دست بردار ہو جانا چاہیئے، اور اللہ کے مقابلہ میں وہی رویّہ اختیار کر لینا چاہیئے جو ایک بندے کا اپنے مالک کے مقابلہ میں ہونا لازم ہے۔ یہی چیز دراصل کفر اور اسلام کے درمیان فارق ہے۔ کفر کی حالت اس کے سوا کچھ نہیں کہ آدمی اپنے آپ کو اللہ کے مقابلہ میں خود مختار اور غیر جواب دہ سمجھے اور یہی سمجھ کر اپنے لیے زندگی کا راستہ اختیار کرے اور اسلام کی حالت اس کے سوا کسی اور چیز کا نام نہیں کہ انسان اپنے آپ کو اللہ کا بندہ اور اس کے سامنے جواب دہ سمجھے اور اسی احساسِ بندگی و ذمہ داری کے ساتھ دُنیا میں زندگی بسر کرے۔ پس حالتِ کفر سے نکل کر حالت اسلام میں آنے کے لیے جس طرح اللہ کی حاکمیت کا سچّا اور قلبی اقرار ضروری ہے اسی طرح اسلام میں رہنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی کے دل میں بندگی کا احساس و شعور ہر دم تازہ، ہر وقت زندہ اور ہر آن کار فرما رہے۔ کیونکہ اس احساس شعور کے دل سے دور ہوتے ہی خود مختاری و غیر ذمہ داری کا رویّہ عود کر آتا ہے، اور کفر کی وہ

حالت پیدا ہو جاتی ہے جس میں آدمی یہ سمجھتے ہوئے کام کرتا ہے کہ نہ اللہ اس کا حاکم ہے اور نہ اسے اللہ کو اپنے عمل کا حساب دینا ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، نماز کا اوّلین مقصد انسان کے اندر "اسلام" کی اسی حالت کو پے در پے تازہ کرتے رہنا ہے، اور یہی روزے کا مقصد بھی ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ نماز روزانہ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے اس کو تازہ کرتی ہے، اور رمضان کے روزے سال بھر میں ایک مرتبہ پورے ۷۲۰ گھنٹوں تک پیہم اس حالت کو آدمی پر طاری رکھتے ہیں تاکہ وہ پوری قوّت کیساتھ دل و دماغ میں بیٹھ جائے اور سال کے باقی گیارہ مہینوں تک اس کے اثرات قائم رہیں۔ اول تو روزے کے سخت ضابطے کو اپنے اوپر نافذ کرنے کے لیے کوئی شخص اس وقت تک آمادہ ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اللہ کو اپنا حاکم اعلیٰ نہ سمجھتا ہو اور اس کے مقابلہ میں اپنی آزادی و خود مختاری سے دست بردار نہ ہو چکا ہو۔ پھر جب وہ دن کے وقت مسلسل بارہ بارہ تیرہ تیرہ گھنٹے کھانے پینے اور مباشرت کرنے سے رکا رہتا ہے، اور جب سحری کا وقت ختم ہوتے ہی نفس کے مطالبات سے یکایک ہاتھ کھینچ لیتا ہے، اور جب افطار کا وقت آتے ہی نفس کے مطلوبات کی طرف اس طرح لپکتا ہے کہ گویا فی الواقع اس کے ہاتھوں اور اس کے منہ اور حلق پر کسی اور کی حکومت ہے، جس کے بند کرنے سے وہ بند ہوتے اور

جس کے کھولنے سے وہ کھلتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس دوران میں اللہ کی حاکمیت اور اپنی بندگی کا احساس اس پر ہر وقت طاری ہے، اس پورے ایک مہینہ کی طویل مدّت میں یہ احساس اس شعور یا تحت الشعور سے ایک لمحہ کے لیے بھی غائب نہیں ہوا۔ کیونکہ اگر غائب ہو جاتا تو ممکن ہی نہ تھا کہ وہ ضابطہ کو توڑنے سے باز رہ جاتا۔

اطاعتِ امر

احساسِ بندگی کے ساتھ خود بخود جو چیز لازمی نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو جس کا بندہ سمجھ رہا ہے اس کے حکم کی اطاعت کرے۔

ان دونوں چیزوں میں ایسا فطری اور منطقی تعلق ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو ہی نہیں سکتے، نہ ان کے درمیان کبھی تناقض (In-Consistency) کے لیے گنجائش نکل سکتی ہے۔ اس لیے کہ اطاعت دراصل نتیجہ ہی اعتراف خداوندی کا ہے۔ آپ کسی کی اطاعت کر ہی نہیں سکتے جب تک کہ اس کی خداوندی[1] نہ مان لیں، اور جب

---

[1] مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ناظرین چند اصطلاحات کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیں۔ فارسی زبان میں لفظ خدا کے وہی معنی ہیں جو عربی میں الٰہ اور رب کے معنی ہیں۔ انگریزی میں چھوٹے حرف کے ساتھ (god) کا بھی قریب قریب یہی مفہوم ہے۔ ہندی میں دیوتا کے الفاظ بھی اسی کے قریب المعنی ہیں۔ ان تمام الفاظ کا استعمال دنیا کی مختلف قومیں ایسی ہستیوں کے متعلق کرتی (باقی ص۶۲ پر)

حقیقت میں کسی کی خداوندی آپ مان چکے ہیں تو اس کی بندگی واطاعت

(بقیہ صفحہ گذشتہ) رہتی ہیں جن کے ہاتھ میں انسان کو نفع اور نقصان پہنچانے کے اختیارات ہوں، جن کا حکم اس کائنات کے نظام میں چھوٹے یا بڑے پیمانہ پر چلتا ہو، جن کی بندگی بجا لانے پر ہی انسان کی فلاح وکامرانی موقوف ہو۔ جاہل قوموں کا ہمیشہ یہ گمان رہا ہے اور اب بھی ہے کہ ایسی ہستیاں بہت بلکہ بے شمار ہیں۔ اور ان میں صرف غیر انسانی وجود مثلاً فرشتے اور جن ہی شامل نہیں ہیں بلکہ بعض انسان مثلاً بادشاہ، اولیاء اور غیر معمولی کمالات دکھانے والے لوگ بھی شامل ہیں۔ اس لیے قریب قریب سب زبانوں میں ان الفاظ کی جمع آتی ہے۔ چنانچہ عربی میں الٰہ اور ارباب، فارسی میں خدائیگان اور خداوندان، انگریزی میں (gods) اور ہندی میں دیویوں اور دیوتاؤں کے الفاظ جمع کے ساتھ ہیں۔ مگر ان سب کے اوپر ایک ایسی ہستی کا تصور بھی تمام قوموں میں رہا ہے جو ساری کائنات کی خالق ہے اور جو سب سے بالاتر ہے۔ عربی میں اللہ، فارسی میں خدائے خدائیگان، انگریزی میں بڑے حروف کے ساتھ (God) اور ہندی میں پرمیشور اسی ہستی کے نام ہیں اور اس کے نام کی جمع کسی زبان میں نہیں آتی۔ اسلام جس چیز کی دعوت دیتا ہے وہ یہ ہے کہ جن اختیارات و اقتدارات کے لیے تم الٰہ اور خداوند وغیرہ کے الفاظ بولتے ہو وہ تنہا اسی ہستی کے ہاتھ میں ہیں۔ ساری کائنات میں صرف اسی کا حکم چلتا ہے، تمہارا نفع اور نقصان اسی کے ہاتھ میں ہے اور جن جن کو تم اس سلطنت میں ذی اقتدار سمجھ کر خدا اور (باقی ص۷۳ پر)

سے کسی طرح باز نہیں رہ سکتے۔ انسان نہ اتنا احمق ہے کہ خواہ مخواہ کسی کا حکم مانتا چلا جائے درآنحالیکہ اس کے حقِ حکمرانی کو تسلیم نہ کرتا ہو۔ اور نہ انسان میں اتنی جرأت موجود ہے کہ وہ فی الواقع اپنے قلب و روح میں جسے حاکم ذی اقتدار سمجھتا ہو اور جسے نافع و ضار اور پروردگار مانتا ہو اس کی اطاعت سے منہ موڑ جائے۔ پس درحقیقت خداوندی کے اعتراف اور بندگی و طاعت کے عمل میں لازم و ملزوم کا تعلق ہے اور یہ عین عقل و منطق کا تقاضا ہے کہ ان دونوں کے درمیان ہر پہلو سے کامل توافق ہو۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) خداوند اور دیوتا مانتے ہو وہ سب تمہاری ہی طرح اس کے بندے ہیں۔ حقیقی اقتدار میں ان کا ذرہ برابر کوئی حصہ نہیں۔ لہٰذا الٰہ اور رب اور خداوند اور گاڈ اور دیو بہت سے نہیں بلکہ صرف وہی ایک ہے جس کو تم اللہ اور دوسرے ہم معنی الفاظ سے یاد کرتے ہو۔ اس تعلیم کے لحاظ سے اصطلاحات میں جو فرق واقع ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ غیر مسلم کے لیے تو وہی پچھلی اصطلاحیں برقرار رہیں گی اور وہ چھوٹے خداؤں اور بڑے خدا کے لیے الگ الگ الفاظ استعمال کرے گا۔ مگر مسلمان کے لیے الٰہ اور رب وہی ہوگا جو اللہ ہے۔ گاڈ صرف بڑے حرف کے ساتھ باقی رہے گا۔ اور چھوٹے حرف سے استعمال نہ ہوگا۔ دیو اور دیوتا کے الفاظ پرمیشور میں گم ہو جائیں گے خدا اور خداوند کے الفاظ صرف خداوند عالم کے ساتھ خاص ہو جائیں گے اور ان میں سے کسی لفظ کی جمع استعمال نہ کی جائے گی۔

آقائی و خداوندی میں توحید لامحالہ بندگی و طاعت میں توحید پر منتج ہوگی، اور آقائی و خداوندی میں شرک کا نتیجہ لازماً بندگی و اطاعت میں شرک ہوگا۔ آپ ایک کو خدا سمجھیں گے تو ایک ہی کی بندگی بھی کریں گے۔ دس کی خداوندی تسلیم کریں گے تو بندگی و طاعت کا رُخ بھی ان دسوں کی طرف پھرے گا۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ آپ خداوندی دس کی تسلیم کر رہے ہوں اور اطاعت ایک کی کریں۔

ذاتِ خداوندی کا تعیّن لامحالہ سمتِ بندگی کے تعیّن پر منتج ہوگا۔ آپ جس کی خداوندی کا اعتراف کریں گے لازماً اطاعت بھی اسی کی کریں گے۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ خداوند ایک کو مانیں اور اطاعت دوسرے کی کریں۔ تعارض کا امکان زبانی اعتراف اور واقعی بندگی میں تو ضرور ممکن ہے۔ مگر قلب و روح کے حقیقی احساس و شعور اور جوارح کے عمل میں ہرگز ممکن نہیں۔ کوئی عقل اس چیز کا تصوّر نہیں کر سکتی کہ آپ فی الحقیقت اپنے آپ کو جس کا بندہ سمجھ رہے ہیں اس کے بجائے آپ کی بندگی کا رُخ کسی ایسی ہستی کی طرف پھر سکتا ہے جس کا بندہ آپ فی الحقیقت اپنے آپ کو نہ سمجھتے ہوں۔ بخلاف اس کے عقل یہ فیصلہ کرتی ہے کہ جس طرف بھی آپ کی بندگی کا رُخ پھر رہا ہے اسی کی خداوندی کا نقش دراصل آپ کے ذہن پر مرتسم ہے، خواہ زبان سے آپ اس کے سوا کسی

اور کی خداوندی کا اظہار کر رہے ہوں۔

خداوندی کے اعتراف اور بندگی کے احساس میں کمی بیشی لازماً اطاعت امر کی کمی بیشی پر منتج ہوگی۔ کسی کے خدا ہونے اور اپنے بندہ ہونے کا احساس آپ کے دل میں جتنا زیادہ شدید ہوگا اسی قدر زیادہ شدت کے ساتھ آپ اس کی اطاعت کریں گے، اور اس احساس میں جتنی کمزوری ہوگی اتنی اطاعت میں کمی واقع ہو جائے گی، حتیٰ کہ اگر یہ احساس بالکل نہ ہو تو اطاعت بھی بالکل نہ ہوگی۔

ان مقدمات کو ذہن نشین کرنے کے بعد یہ بات بالکل صاف واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کا مدعا اللہ کی خداوندی کا اقرار کرانے اور اس کے سوا ہر ایک کی خداوندی کا انکار کرا دینے سے اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی بندگی و اطاعت نہ کرے جب وہ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ[1] کہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اطاعت خالصاً و مخلصاً صرف اللہ کے لیے ہے۔ کسی دوسری مستقل بالذات اطاعت کی آمیزش اس کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ جب وہ کہتا ہے کہ وَمَا أُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ

---

[1] آگاہ رہو اللہ ہی کے لیے ہے اطاعت خالص (الزمر، ۳) لفظ "دین" کے اصل معنی اطاعت کے ہیں اور مذہب و ملت کے لئے اس لفظ کا استعمال مجازاً اس بنا پر ہوتا ہے کہ مذہب و ملت در اصل ایک نظام اطاعت کا نام ہے جس کے دائرے میں داخل ہو جانے کے بعد آدمی ایک قانون اور ضابطہ کی فرمانبرداری اختیار کرتا ہے۔

لَهُ الدِّیْنَ [1] تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ صرف اللہ ہی کی بندگی کرنے پر انسان مامور ہے اور اس کی بندگی کرنے کی شرط یہ ہے کہ انسان اس کی اطاعت کے ساتھ کسی دوسرے کی اطاعت مخلوط نہ کرے جب وہ کہتا ہے کہ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ [2] كُلُّهٗ لِلّٰهِ، تو اس کا صاف اور صریح مطلب یہ ہوتا ہے کہ مسلمان کی اطاعت پوری کی پوری اللہ ہی کے لیے وقف ہے اور ہر اس طاقت سے مسلمان کی جنگ ہے جو اس اطاعت میں حصہ بٹانا چاہتی ہو۔ جس کا مطالبہ یہ ہو کہ مسلمان خداوند عالم کے ساتھ اس کی اطاعت بھی کرے، یا خداوند عالم کے بجائے صرف اسی کی اطاعت کرے۔ پھر جب وہ کہتا ہے کہ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ [3] تو اس کا صاف اور صریح مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی اطاعت تمام اطاعتوں پر غالب ہو، اطاعت اور بندگی کا پورا نظام اپنے تمام شعبوں اور سارے پہلوؤں کے ساتھ اطاعت

---

[1] اور نہیں حکم دیے گئے سوائے اس کے کہ اللہ کی بندگی کریں خالص کرتے ہوئے اس کے لیے دین۔ (البینہ، ۵)

[2] لڑتے رہو ان سے یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لیے ہو جائے۔ (الانفال، ۳۹)

[3] وہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ تاکہ وہ غالب کر دے اسے سارے دین پر (الفتح، ۲۸)

الٰہی کے نیچے آ جائے، جس کی فرمانبرداری بھی ہو خداوند عالم کی اجازت کے تحت ہو، اور جس فرمانبرداری کے لیے وہاں سے حکم یا سندِ جواز نہ ملے اس کا بند کاٹ ڈالا جائے، یہ اس دینِ حق اور اس ہدایت کا تقاضا ہے جو اللہ اپنے رسول کے ذریعے بھیجتا ہے۔ اس تقاضے کے مطابق خواہ انسان کے ماں باپ ہوں، خواہ خاندان اور سوسائٹی ہو، خواہ قوم اور حکومت ہو، خواہ ایریا لیڈر ہو، خواہ علماء اور مشائخ ہوں، خواہ وہ شخص یا ادارہ ہو جس کی انسان ملازمت کرکے پیٹ پالتا ہے، اور خواہ انسان کا اپنا نفس اور اس کی خواہشات ہوں۔ کسی کی اطاعت بھی خداوند عالم کی اصلی اور بنیادی اطاعت کی قید سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتی۔ اصل مطاع اللہ تعالیٰ ہے۔ جو اس کی خداوندی کا اقرار کر چکا اور جس نے اس کے لیے اپنی زندگی کو خالص کر لیا، وہ جس کی اطاعت بھی کرے گا، اللہ ہی کی اطاعت کے تحت رہ کر کرے گا۔ جس حد تک جس کی بات ماننے کی وہاں سے اجازت ہوگی اسی حد تک مانے گا۔ اور جہاں اجازت کی حد ختم ہو جائے گی وہاں وہ ہر ایک کا باغی اور صرف اللہ کا فرمانبردار نکلے گا۔

روزے کا مقصد آدمی کو اسی اطاعت کی تربیت دینا ہے۔ وہ مہینہ بھر تک روزانہ کئی کئی گھنٹے آدمی کو اس حالت میں رکھتا ہے کہ اپنی بالکل ابتدائی (Elementary) ضرورت پوری کرنے

کے لیے بھی اس کو خداوند عالم کے اذن و اجازت کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ غذا کا ایک لقمہ اور پانی کا ایک قطرہ تک وہ حلق سے گذار نہیں سکتا۔ جب تک کہ وہاں سے اجازت نہ ملے۔ ایک ایک چیز کے استعمال کے لیے وہ شریعت خداوندی کی طرف دیکھتا ہے۔ جو کچھ وہاں حلال ہے وہ اس کے لیے حلال ہے، خواہ تمام دُنیا اسے حرام کرنے پر متفق ہو جائے، اور جو کچھ وہاں حرام ہے وہ اس کے لیے حرام ہے، خواہ ساری دُنیا مل کر اسے حلال کر دے۔ اس حالت میں خدائے واحد کے سوا کسی کا اذن اس کے لیے اذن نہیں، کسی کا حکم اس کے لیے حکم نہیں، اور کسی کی نہی اس کے لیے نہی نہیں۔ خود اپنے نفس کی خواہش سے لے کر دُنیا کے ہر انسان اور ہر ادارے تک کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جس کے حکم سے مسلمان رمضان میں روزہ چھوڑ سکتا ہو یا توڑ سکتا ہو۔ اس معاملہ میں نہ بیٹے پر باپ کی اطاعت ہے، نہ بیوی پر شوہر کی، نہ ملازم پر آقا کی، نہ رعیت پر حکومت کی، نہ پیرو پر لیڈر یا امام کی۔ بالفاظ دیگر اللہ کی بڑی اور اصلی اطاعت تمام اطاعتوں کو کھا جاتی ہے اور ۷۲۰ گھنٹہ کی طویل مشق و تمرین سے روزہ دار کے دل پر کالنقش فی الحجر یہ سکہ بیٹھ جاتا ہے کہ ایک ہی مالک کا وہ بندہ ہے، ایک ہی قانون کا وہ پیرو ہے اور ایک ہی اطاعت کا حلقہ اس کی گردن میں پڑا ہے۔

اس طرح یہ روزہ انسان کی فرمانبرداریوں اور اطاعتوں کو ہر طرف سے سمیٹ کر ایک مرکزی اقتدار کی جانب پھیر دیتا ہے اور تیس دن تک روزانہ بارہ بارہ چودہ چودہ گھنٹہ تک اسی سمت میں جمائے رکھتا ہے تاکہ اپنی بندگی کے مرجع اور اپنی اطاعت کے مرکز کو وہ اچھی طرح متحقق کرے اور رمضان کے بعد جب اس ڈسپلن کے بند کھول دیئے جائیں تو اس کی اطاعتیں اور فرمانبرداریاں بکھر کر مختلف مرجعوں کی طرف بھٹک نہ جائیں۔ اطاعتِ امر کی اس تربیت کے لیے بظاہر انسان کی صرف دو خواہشوں (یعنی غذا لینے کی خواہش اور صنفی خواہش) کو چھانٹ لیا گیا ہے اور ڈسپلن کی ساری پابندیاں صرف انہی دو پر لگائی گئی ہیں۔ لیکن روزے کی اصل روح یہ ہے کہ آدمی پر اس حالت میں خدا کی خداوندی اور بندگی و غلامی کا احساس پوری طرح طاری ہو جائے اور وہ ایسا مطیع امر ہو کر یہ ساعتیں گزارے کہ ہر اس چیز سے رکے جس سے خدا نے روکا ہے، اور ہر اس کام کی طرف دوڑے جس کا حکم خدا نے دیا ہے۔ روزے کی فرضیت کا اصل مقصد اسی کیفیت کو پیدا کرنا اور نشو و نما دینا ہے نہ کہ محض کھانے پینے اور مباشرت سے روکنا۔ یہ کیفیت جتنی زیادہ ہو روزہ اتنا ہی مکمل ہے۔ اور جتنی اس میں کمی ہو اتنا ہی وہ ناقص ہے۔ اگر کسی آدمی نے اس احمقانہ طریقے سے روزہ رکھا کہ جن جن چیزوں سے روزہ ٹوٹتا ہے

ان سے تو پرہیز کرتا رہا اور باقی تمام ان افعال کا ارتکاب کیے چلا گیا جنھیں خدا نے حرام کیا ہے تو اس کے روزہ کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک مردہ لاش کہ اس میں اعضاء تو سب کے سب موجود ہیں، جن سے صورتِ انسانی بنتی ہے مگر جان نہیں ہے جس کی وجہ سے انسان انسان ہے۔ جس طرح اس بے جان لاش کو کوئی شخص انسان نہیں کہہ سکتا اسی طرح اس بے روح روزے کو بھی کوئی روزہ نہیں کہہ سکتا۔ یہی بات ہے جو نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمائی کہ:۔

من لم یدع قول الزور والعمل بہٖ فلیس للہ حاجۃ فی ان یدع طعامہ و شرابہ۔[1]	جس نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا، تو خدا کو اس کی حاجت نہیں ہے کہ وہ اپنا کھانا اور پینا چھوڑ دے۔

جھوٹ بولنے کے ساتھ "جھوٹ پر عمل کرنے" کا جو ارشاد فرمایا گیا ہے یہ بڑا ہی معنی خیز ہے در اصل یہ لفظ تمام نافرمانیوں کا جامع ہے۔ جو شخص خدا کو خدا کہتا ہے اور پھر اس کی نافرمانی کرتا ہے وہ حقیقت میں خود اپنے اقرار کی تکذیب کرتا ہے۔ روزے کا اصل مقصد تو عمل سے اقرار کی تصدیق ہی کرنا تھا، مگر جب وہ روزے کے دوران میں اس کی تکذیب کرتا رہا تو پھر روزے میں بھوک پیاس کے سوا اور

---

[1] بخاری، کتاب الصوم۔

کیا باقی رہ گیا؟ حالانکہ خدا کو اس کے بھوکے رہنے کی کوئی حاجت نہ تھی۔ اسی بات کو دوسرے انداز میں حضور نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

کم من صائم لیس له من صیامه الا الظما وکم من قائم لیس له من قیامه الا السهر (سنن الدارمی)

"کتنے ہی روزہ دار ایسے ہیں کہ روزے سے بھوک پیاس کے سوا ان کے پلے کچھ نہیں پڑتا اور کتنے ہی راتوں کو عبادت میں کھڑے رہنے والے ایسے ہیں جنہیں اس قیام سے رت جگے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا"

یہی بات ہے جس کو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے واضح تر الفاظ میں ظاہر فرما دیا:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ. (البقرہ۔ ۱۸۳)

تم پر روزے فرض کیے گئے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے توقع ہے کہ اس ذریعہ سے تم تقویٰ کرنے لگو گے۔

یعنی روزے فرض کرنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو۔ تقویٰ کے اصل معنی حذر اور خوف کے ہیں۔ اسلامی اصطلاح میں اس سے مراد خدا سے ڈرنا اور اس کی نافرمانی سے بچنا ہے۔ اس لفظ کی بہترین تفسیر جو میری نظر سے گذری ہے، وہ ہے جو حضرت ابی ابن کعبؓ نے بیان کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا تقویٰ کسے کہتے ہیں؟ انہوں نے عرض کیا "امیرالمومنینؓ آپ کو کبھی کسی ایسے رستے سے گذرنے کا اتفاق ہوا ہے جس کے دونوں طرف خاردار جھاڑیاں ہوں اور راستہ تنگ ہو؟" حضرت عمرؓ نے فرمایا "بارہا"۔ انہوں نے پوچھا "تو ایسے موقع پر آپ کیا کرتے ہیں؟" حضرت

عمرؓ نے فرمایا: میں دامن سمیٹ لیتا ہوں اور بچتا ہوا چلتا ہوں کہ دامن کانٹوں میں نہ الجھ جائے۔ حضرت ابیؓ نے کہا: بس اسی کا نام تقویٰ ہے۔ زندگی کا یہ راستہ جس پر انسان سفر کر رہا ہے، دونوں طرف افراط و تفریط، خواہشات و میلانات نفس، وساوس اور ترغیبات [illegible] گمراہیوں اور نافرمانیوں کی خاردار جھاڑیوں سے گِرا ہُوا ہے۔ اس راستے پر کانٹوں سے اپنا دامن بچاتے ہوئے چلنا اور اطاعت حق کی راہ سے ہٹ کر بداندیشی و بدکرداری کی جھاڑیوں میں نہ اُلجھنا یہی تقویٰ ہے۔ اور یہی تقویٰ پیدا کرنے کے لیے اللہ تعالےٰ نے روزے فرض کئے ہیں۔ یہ ایک مقوی دوا ہے جس کے اندر خُداترسی و راست روی کو قوت بخشنے کی خاصیت ہے۔ مگر فی الواقع اس سے یہ قوت حاصل کرنا انسان کی اپنی استعداد پر موقوف ہے۔ اگر آدمی روزے کے مقصد کو سمجھے، اور جو قوت روزہ دیتا ہے اس کو لینے کے لیے تیار ہو، اور روزہ کی مدد سے اپنے اندر خوفِ خُدا اور اطاعت امر کی صفت کو نشوونما دینے کی کوشش کرے تو یہ چیز اس میں اتنا تقویٰ پیدا کر سکتی ہے کہ صرف رمضان ہی میں نہیں بلکہ اس کے بعد بھی سال کے باقی گیارہ مہینوں میں وہ زندگی کی سیدھی شاہراہ پر دونوں طرف کی خاردار جھاڑیوں سے دامن بچائے ہوئے چل سکتا ہے۔ اس صورت میں اس کے لیے روزے کے نتائج (ثواب) اور منافع (اجر) کی کوئی حد نہیں۔ لیکن اگر وہ اصل مقصد سے غافل ہو

کہ شخص روزہ نہ توڑنے ہی کو روزہ رکھنا سمجھے اور تقویٰ کی صفت حاصل کرنے کی طرف توجہ ہی نہ کرے تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے نامۂ اعمال میں بھوک پیاس اور رت جگے کے سوا اور کچھ نہیں پا سکتا۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

كل عمل ابن آدم يضاعف الحسنة بعشر امثالها الى سبع مائة ضعف قال الله تعالى الا الصوم فانه لي وانا اجزي به۔ (متفق علیہ)

آدمی کا ہر عمل خدا کے ہاں کچھ نہ کچھ بڑھتا ہے۔ ایک نیکی دس گنی سے سات سو گنی تک جیسی پھولتی ہے۔ مگر اللہ فرماتا ہے کہ روزہ مستثنیٰ ہے، وہ میری مرضی پر موقوف ہے جتنا چاہوں اس کا بدلہ دوں۔

یعنی روزے کے معاملے میں بالیدگی و افزونی کا امکان بے حد و حساب ہے۔ آدمی اس سے تقویٰ حاصل کرنے کی جتنی کوشش کرے اتنا ہی وہ بڑھ سکتا ہے۔ صفر کے درجہ سے لے کر اوپر لاکھوں، کروڑوں، اربوں گنے تک وہ جا سکتا ہے بلکہ بلانہایت ترقی کر سکتا ہے۔ پس یہ معاملہ چونکہ آدمی کی اپنی استعداد اخذ و قبول پر منحصر ہے کہ روزہ سے تقویٰ حاصل کرے یا نہ کرے، اور کرے تو کس حد تک کرے، اس وجہ سے آیت مذکورہ بالا میں یہ نہیں فرمایا کہ روزے رکھنے سے تم یقیناً متقی ہو جاؤ گے، بلکہ لَعَلَّكُمْ[1] کا لفظ فرمایا جس کا ٹھیٹ مطلب یہ ہے کہ توقع کی جاتی ہے۔ یا ممکن ہے کہ اس

---

[1] عام طور پر لوگ اس کا ترجمہ "تاکہ" کرتے ہیں، مگر یہ لغت کے اعتبار سے درست نہیں۔ لَعَلَّكُمْ کا لفظ عربی میں امید، توقع، اندیشہ اور امکان بلا وثوق کا مفہوم ادا کرنے کے لئے (باقی تنبیہ پر)

ذریعہ سے تم تقویٰ کرنے لگو گے۔

تعمیر سیرت یہ تقویٰ ہی دراصل اسلامی سیرت کی جان ہے۔ جس نوعیت کا کیرکٹر اسلام ہر مسلمان فرد میں پیدا کرنا چاہتا ہے اس کا اسلامی تصور، اس تقویٰ کے لفظ میں پوشیدہ ہے۔ افسوس ہے کہ آجکل اس لفظ کا مفہوم بہت محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ایک خاص طرز کی شکل و وضع بنا لینا، چند مشہور و نمایاں گناہوں سے بچنا اور بعض ایسے مکروہات سے پرہیز کرنا جنہوں نے عوام کی نگاہ میں اہمیت اختیار کر لی ہے بس اسی کا نام تقویٰ ہے۔ حالانکہ دراصل یہ ایک نہایت وسیع اصطلاح ہے جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔ قرآن مجید انسانی طرزِ خیال و طرزِ عمل کو اصولی حیثیت سے دو بڑی قسموں پر تقسیم کرتا ہے:۔

ایک قسم وہ ہے جس میں انسان:۔	دوسری قسم وہ ہے جس میں انسان:۔
۱۔ دنیوی طاقتوں کے ماسوا کسی بالاتر اقتدار کو اپنے اوپر نگران نہیں	۱۔ اپنے آپ کو ایک ایسے بالاتر حکمران کا تابع اور اس کے سامنے جواب دہ

(بقیہ صفحہ گذشتہ) کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ بخلاف اس کے "تاکہ" میں محض تعلل یا فرضیت کا مفہوم ہے۔ اگر اللہ کو صرف فرضیت صوم کی غرض ہی بیان کرنی ہوتی تو لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کے بجائے لِتَكُوْنُوْا مِنَ الْمُتَّقِيْنَ فرمایا ہوتا۔ شاید لوگ اس موقع پر کلمۂ شک دیکھ کر اس کی حکمت نہ سمجھ سکے۔ اس لیے انہوں نے لَعَلَّ کا ترجمہ "تاکہ" کر دیا۔ تاکہ صحیح ترجمہ سے جو بات بنتی نظر نہ آتی تھی وہ غلط ترجمہ سے بن جائے۔

سمجھتا اور یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرتا ہے کہ اسے کسی فوق البشر حاکم کے سامنے جواب دہی نہیں کرنی ہے۔

۲۔ دنیوی زندگی ہی کو زندگی، دنیوی فائدے ہی کو فائدہ اور دنیوی نقصان ہی کو نقصان سمجھتا ہے اور اس بنا پر کسی طریقہ کو اختیار کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ صرف دنیوی فائدے اور نقصان ہی کے لحاظ سے کرتا ہے۔

۳۔ مادی فائدوں کے مقابلہ میں، اخلاقی و روحانی فضائل کو بے وقعت سمجھتا ہے اور مادی نقصانات کے مقابلہ میں اخلاقی و روحانی نقصانات کو ہلکا خیال کرتا ہے۔

۴۔ کسی مستقل اخلاقی دستور کی پابندی نہیں کرتا بلکہ موقع و محل کے لحاظ سے خود ہی اخلاقی اصول وضع کرتا ہے اور دوسرے موقع پر خود ہی ان کو بدل دیتا ہے۔

سمجھتا ہے جو عالم الغیب والشہادت ہے۔ اور یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرتا ہے کہ اسے ایک روز اپنی دنیوی زندگی کے پورے کارنامے کا حساب دینا ہوگا۔

۲۔ دنیوی زندگی کو اصل حیات انسانی کا صرف ایک ابتدائی مرحلہ سمجھتا ہے اور ان فوائد و نقصانات کو جو اس مرحلہ میں ظاہر ہوتے ہیں عارضی اور دھوکہ دینے والے نتائج خیال کرتا ہے اور اپنے طرزِ عمل کا فیصلہ ان مستقل فائدوں اور نقصانات کی بنیاد پر کرتا ہے جو آخرت کی پائدار زندگی میں ظاہر ہوں گے۔

۳۔ مادی فائدوں کے مقابلہ میں اخلاقی و روحانی فضائل کو زیادہ قیمتی سمجھتا ہے اور مادی نقصانات کی بہ نسبت اخلاقی و روحانی نقصانات کو شدید تر خیال کرتا ہے۔

۴۔ ایک ایسے مستقل اخلاقی دستور کی پابندی کرتا ہے جس میں اپنی اغراض و مصالح کے لحاظ سے اسے ترمیم و تنسیخ کرنے کی آزادی حاصل نہیں ہے۔

ان میں سے پہلی قسم کے طرزِ خیال و طرزِ عمل کا جامع نام قرآن نے فجور[1] رکھا ہے۔ اور دوسرے طرزِ خیال و عمل کو وہ تقویٰ[2] کے نام سے یاد کرتا ہے۔ یہ دراصل زندگی کے دو مختلف راستے ہیں جو بالکل ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں اور اپنے نقطۂ آغاز سے لے کر نقطۂ انجام تک کہیں ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ فجور کے راستے کو اختیار کرکے آدمی کی پوری زندگی اپنے تمام اجزاء اور تمام شعبوں کے ساتھ ایک خاص ڈھنگ پر لگ جاتی ہے جس میں تقویٰ کی ظاہری اشکال تو کہیں نظر آسکتی ہیں۔ مگر تقویٰ کی اسپرٹ کا شائبہ تک نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ فجور کے تمام فکری اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ منطقی ربط رکھتے ہیں اور تقویٰ کے فکری اجزاء سے کسی جز کو بھی ان کے مربوط نظام میں راہ نہیں مل سکتی۔ برعکس اس کے تقویٰ کا راستہ اختیار کرکے انسان کی پوری زندگی کا ڈھنگ کچھ اور ہوتا ہے، وہ ایک دوسرے ہی طرز پر سوچتا ہے، دنیا کے ہر

---

[1] آجکل کی اصطلاحوں میں ہم اسے مادہ پرستی (Materialism) افادیت (Utilitarianism) مصلحت پرستی (Pragmatism) اور ابن الوقتی (Opportunism) کے ناموں سے موسوم کر سکتے ہیں۔

[2] مغربی ذہن چونکہ اس طرزِ خیال سے بڑی حد تک بیگانہ ہے اس لیے جدید زمانہ کی اصطلاحوں میں ایسے الفاظ مشکل سے مل سکیں گے جو تقویٰ کے مفہوم کو ادا کر سکیں۔ انگریزی لفظ (Piety) کو پاپاؤں اور پادریوں نے اس قابل نہیں چھوڑا کہ اسے استعمال کیا جا سکے۔ نیز اس میں وہ وسعت بھی نہیں جو تقویٰ میں ہے۔

معاملہ اور ہر مسئلہ کو ایک دوسری ہی نگاہ سے دیکھتا ہے، اور ہر موقع و محل پر ایک دوسرا ہی طرز اختیار کرتا ہے۔ ان دونوں راستوں کا فرق صرف انفرادی زندگی ہی سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ اجتماعی زندگی سے بھی اس کا اتنا ہی تعلق ہے۔ جو جماعت فاجر افراد پر مشتمل ہوگی یا جس میں فاجرین کی اکثریت ہوگی اور اہل فجور کے ہاتھ ہی میں جس کی قیادت ہوگی اس کا پورا تمدن فاجرانہ ہوگا۔ اس کی معاشرت میں، اس کے اخلاقیات میں، اس کے معاشیات میں، اس کے نظام تعلیم و تربیت میں، اس کی سیاست میں، اس کے بین الاقوامی رویہ میں، غرض اس کی ہر چیز میں فجور کی روح کارفرما ہوگی۔ یہ بہت ممکن ہے کہ اس کے اکثر یا بعض افراد ذاتی خود غرضیوں اور منفعت پرستیوں سے بالاتر نظر آئیں۔ مگر زیادہ سے زیادہ جس بلندی پر وہ چڑھ سکتے ہیں وہ یہی ہے کہ وہ اپنے ذاتی مفاد کو اس قوم کے مفاد میں گم کر دیں۔ جس کی ترقی سے ان کی اپنی ترقی اور جس کے تنزل سے ان کا اپنا تنزل وابستہ ہے۔ لہٰذا اگر کسی شخصی سیرت میں فجور کا رنگ کم بھی ہو تو اس سے کوئی فرق واقع نہ ہوگا۔ قومی رویہ بہرحال انانیت، ابن الوقتی، منفعت پرستی اور مادہ پرستی ہی کے اصول پر چلے گا۔ اسی طرح تقویٰ بھی محض انفرادی چیز نہیں ہے۔ جب کوئی جماعت متقین پر مشتمل ہوتی ہے یا اس میں اہل تقویٰ کی کثرت ہوتی ہے، اور متقی ہی اس کے رہنما ہوتے ہیں تو اس کے پورے اجتماعی رویہ میں ہر حیثیت سے خدا ترسی کا رنگ ہوتا ہے۔ وہ وقتی اور ہنگامی مصلحتوں

کے لحاظ سے اپنا طرزِ عمل مقرر نہیں کرتی بلکہ ایک مستقل دستور کی
پیروی کرتی ہے اور ایک اٹل نصب العین کے لیے اپنی تمام مساعی
وقف کر دیتی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ دنیوی لحاظ سے
قوم کو کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے یا کیا نقصان پہنچتا ہے۔ وہ مادی فائدوں
کے پیچھے نہیں دوڑتی بلکہ پائدار اخلاقی و روحانی منافع کو اپنا مطمحِ
نظر بناتی ہے۔ وہ مواقع کے لحاظ سے اصول توڑتی اور بناتی نہیں
ہے بلکہ ہر حال میں اصولِ حق کا اتباع کرتی ہے۔ کیونکہ اسے اس کی
پروا نہیں ہوتی کہ اس کی مدِ مقابل قوموں کی طاقت کم ہے یا زیادہ
بلکہ اوپر جو خدا موجود ہے وہ اس سے ڈرتی ہے اور اس کے سامنے
کھڑے ہو کر جواب دہی کرنے کا جو وقت بہرحال آنا ہے اس کی
فکر اسے کھائے جاتی ہے۔

اسلام کے نزدیک دنیا میں فساد کی جڑ اور انسانیت کی تباہی و
بربادی کا اصلی سبب "فجور" ہے۔ وہ اس فجور کے سانپ کو ہلاک کر دینا
چاہتا ہے یا کم سے کم اس کے زہریلے دانت توڑ دینا چاہتا ہے تاکہ
تاکہ اگر یہ سانپ جیتا رہے تب بھی انسانیت کو ڈسنے کی طاقت اس
میں باقی نہ رہے۔ اس کام کے لیے وہ نوعِ انسانی میں سے ان لوگوں کو
چُن چُن کر نکالنا اور اپنی پارٹی میں بھرتی کرنا چاہتا ہے جو متقیانہ رجحانِ
طبع رکھتے ہوں۔ فجور کی جانب ذہنی رجحان (Bent of Mind) رکھنے
والے لوگ اس کے کسی کام کے نہیں۔ خواہ وہ اتفاق سے مسلمانوں کے

گھر میں پیدا کیے گئے ہوں اور مسلم قوم کے درد میں کتنے ہی تڑپتے ہوں۔ اسے دراصل ضرورت ان لوگوں کی ہے جن میں خود اپنی ذمہ داری کا احساس ہو، جو آپ اپنا حساب لینے والے ہوں، جو خود اپنے دل کی نیتوں اور ارادوں پر نظر رکھیں، جن کو قانون کی پابندی کے لیے کسی خارجی دباؤ کی حاجت نہ ہو بلکہ خود ان کے اپنے باطن میں ایک محاسب اور آمر بیٹھا ہو جو انہیں اندر سے قانون کا پابند بناتا ہو اور ایسی قانون شکنی پر بھی ٹوکتا ہو جس کا علم کسی پولیس، کسی عدالت اور کسی رائے عام کو نہیں ہو سکتا۔ وہ ایسے افراد چاہتا ہے جنہیں یقین ہو کہ ایک آنکھ ہر حال میں انہیں دیکھ رہی ہے، جنہیں خوف ہو کہ ایک عدالت کے سامنے بہرحال انہیں جانا ہے، جو دنیوی منافع کے بندے، ہنگامی مصالح کے غلام اور شخصی یا قومی اغراض کے پرستار نہ ہوں۔ جن کی نظر آخرت کے اصلی و حقیقی نتائج پر جمی ہوئی ہو، جن کو دنیا کے بڑے سے بڑے فائدے کا لالچ یا سخت سے سخت نقصان کا خوف بھی خداوند عالم کے دیئے ہوئے نصب العین اور اس کے بتائے ہوئے اصولِ اخلاق سے نہ ہٹا سکتا ہو، جن کی تمام سعی و کوشش صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہو، جنہیں اس امر کا پختہ یقین ہو کہ پایانِ کار بندگیٔ حق ہی کا نتیجہ بہتر اور بندگیٔ باطل ہی کا انجام بُرا ہوگا، چاہے اس دنیا میں معاملہ برعکس ہو۔ پھر اس کو جن آدمیوں کی تلاش ہے وہ ایسے آدمی ہیں جن کے اندر اتنا صبر موجود ہو کہ ایک صحیح اور بلند نصب العین

کے لیے برسوں بلکہ ساری عمر لگاتار سعی بے حاصل کر سکتے ہوں، جن میں اتنی ثابت قدمی ہو کہ غلط راستوں کی آسانیاں، فائدے اور لطف و لذت کوئی چیز بھی ان کو اپنی طرف نہ کھینچ سکتی ہو، جن میں اتنا تحمل ہو کہ حق کے راستہ پر چلنے میں خواہ کسی قدر ناہمواریوں، مشکلات، خطرات، مصائب اور شدائد کا سامنا ہو، ان کا قدم نہ ڈگمگائے، جن میں اتنی یکسوئی ہو کہ ہر قسم کی عارضی اور ہنگامی مصلحتوں سے نگاہ پھیر کر اپنے نصب العین کی طرف بڑھے چلے جائیں، جن میں اتنا توکل موجود ہو کہ حق پرستی و حق کوشی کے دیرطلب اور دوررس نتائج کے لیے خداوند عالم پر بھروسہ کر سکیں۔ خواہ دُنیا کی زندگی میں اس کام کے نتائج سرے سے برآمد ہوتے نظر ہی نہ آئیں۔ ایسے ہی لوگوں کی سیرت پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اور جو کام اسلام اپنی پارٹی سے لینا چاہتا ہے، اس کے لیے ایسے ہی قابلِ اعتماد کارکنوں کی ضرورت ہے۔

تقویٰ کی اس صفت کا ہیولیٰ (ابتدائی جوہر) جن لوگوں میں موجود ہو ان کے اندر اس صفت کو نشوونما دینے اور اسے مستحکم کرنے کے لیے روزے سے زیادہ طاقتور اور کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ روزے کے ضابطے پر ایک نگاہ ڈالیے، آپ پر خود منکشف ہونے لگے گا کہ یہ چیز کس مکمل طریقہ سے ان صفات کو بالیدگی اور پائیداری بخشتی ہے۔ ایک شخص سے کہا جاتا ہے کہ روزہ خدا نے تم پر فرض کیا ہے۔ صبح سے شام تک کچھ نہ کھاؤ پیو۔ کوئی

چیز حلق سے اتارو گے تو تمہارا روزہ ٹوٹ جائے گا۔ لوگوں کے
سامنے کھانے پینے سے اگر تم نے پرہیز کیا اور در پردہ کھاتے پیتے
رہے تو خواہ لوگوں کے نزدیک تمہارا شمار [illegible] لیکن چونکہ
خدا کے نزدیک نہ ہوگا [illegible] صورت [illegible]
کہ خدا کے لیے رکھو [illegible]
نیک نامی کے لیے [illegible] کوئی قیمت نہیں۔
خدا کے لیے اپنا روزہ پورا کروگے تو اس دنیا میں کوئی انعام نہ ملے
گا اور توڑ دو گے یا نہ رکھو گے تو یہاں کوئی سزا نہ دی جائے گی۔
مرنے کے بعد جب خدا کے سامنے پیش ہو گے اسی وقت انعام
بھی ملے گا۔ اور اسی وقت سزا بھی دی جائے گی۔ یہ چند ہدایات
دے کر آدمی کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ کوئی سپاہی، کوئی ہرکارہ، کوئی سی
آئی۔ ڈی کا آدمی اس پر مقرر نہیں کیا جاتا کہ ہر وقت اس کی نگرانی
کرے۔ زیادہ سے زیادہ رائے عام اپنے دباؤ سے اس کو اس حد تک
مجبور کر سکتی ہے کہ دوسروں کے سامنے کچھ نہ کھائے پئے، مگر
چوری چھپے کھانے پینے سے اس کو روکنے والا کوئی نہیں اور اس
بات کا حساب لینا تو کسی رائے عام یا کسی حکومت کے بس ہی میں
نہیں کہ وہ رضائے الٰہی کی نیت سے روزہ رکھ رہا ہے یا کسی اور
نیت سے۔ ایسی حالت میں بھی جو شخص روزے کی تمام شرائط
پوری کرتا ہے، غور کیجیے کہ اس کے نفس میں کس قسم کی کیفیات

ابھرتی ہیں :-

۱- اس کو خداوند عالم کی ہستی کا، اس کے عالم الغیب ہونے کا، اس کے "قادر مطلق ہونے کا، اور اس کے سامنے اپنے محکوم اور جواب دہ ہونے کا کامل یقین ہے۔ اور اس پوری مدت میں جبکہ وہ روزے سے رہا ہے۔ اس کے یقین میں ذرا تزلزل نہیں آیا۔

۲- اس کو آخرت پر، اس کے حساب کتاب پر اور اس کی جزا اور سزا پر پورا یقین ہے۔ اور یہ یقین بھی کم از کم ان بارہ چودہ گھنٹوں میں برابر غیر متزلزل رہا ہے، جبکہ وہ اپنے روزے کی شرائط پر قائم رہا۔

۳- اس کے اندر خود اپنے فرض کا احساس ہے۔ وہ آپ اپنی ذمہ داری کو سمجھتا ہے، وہ اپنی نیّت کا خود محتسب ہے، اپنے دل کے حال پر خود نگرانی کرتا ہے۔ خارج میں قانون شکنی یا گناہ کا صدور ہونے سے پہلے جب نفس کی اندرونی تہوں میں اس کی خواہش پیدا ہوتی ہے اسی وقت وہ اپنی قوتِ ارادی سے اس کا استیصال کر دیتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پابندیٔ قانون کے لیے خارج میں کسی دباؤ کا وہ محتاج نہیں ہے۔

۴- مادّیت اور اخلاق و روحانیت کے درمیان انتخاب کا جب اسے موقع دیا گیا تو اس نے اخلاق و روحانیت کو انتخاب کیا۔ دنیا اور آخرت کے درمیان ترجیح کا سوال جب اس کے سامنے آیا تو اس نے آخرت کو ترجیح دی۔ اس کے اندر اتنی طاقت تھی

کہ اخلاقی فائدے کی خاطر مادّی نقصان و تکلیف کو اس نے گوارا کیا، اور آخرت کے نفع کی خاطر دنیوی مضرّت کو قبول کر لیا۔

۵۔ وہ اپنے آپ کو اس معاملہ میں آزاد نہیں سمجھتا کہ اپنی سہولت دیکھ کر اچھے موسم، مناسب وقت اور فرصت کے زمانہ میں روزہ رکھے، بلکہ جو وقت قانون میں مقرر کر دیا گیا ہے اسی وقت روزہ رکھنے پر وہ اپنے آپ کو مجبور سمجھتا ہے خواہ موسم کیسا ہی سخت ہو، حالات کیسے ہی ناسازگار ہوں اور اس کی ذاتی مصلحتوں کے لحاظ سے اس وقت روزہ رکھنا کتنا ہی نقصان دہ ہو۔

۶۔ اس میں صبر، استقامت، تحمّل، یکسوئی، توکّل اور دنیوی ترغیبات و تحریصات کے مقابلہ کی طاقت کم ازکم اس حد تک موجود ہے کہ رضائے الٰہی کے بلند نصب العین کی خاطر وہ ایک ایسا کام کرتا ہے جس کا نتیجہ مرنے کے بعد دوسری زندگی پر ملتوی کیا گیا ہے۔ اس کام کے دوران میں وہ رضاکارانہ اپنی خواہشاتِ نفس کو روکتا ہے۔ سخت گرمی کی حالت میں پیاس سے حلق چٹخا جا رہا ہے، برفاب سامنے موجود ہے، آسانی سے پی سکتا ہے۔ مگر نہیں پیتا۔ بھوک کے مارے جان پر بن رہی ہے، کھانا حاضر ہے چاہے تو کھا سکتا ہے، مگر نہیں کھاتا۔ جوان میاں بیوی ہیں، خواہشِ نفس زور کرتی ہے، چاہیں تو اس طرح قضائے شہوت کر سکتے ہیں کہ کسی کو پتہ نہ چلے، مگر نہیں کرتے۔ ممکن الحصول فائدوں سے یہ

صرفِ نظر. اور ممکن الاحتراز نقصانات کی یہ پذیرائی اور خود اپنے منتخب کیے ہوئے طریقِ حق پر ثابت قدمی کسی ایسے نفع کی امید پر نہیں ہے جو اس دُنیا کی زندگی میں حاصل ہونے والا ہو بلکہ ایسے مقصد کے لیے ہے جس کے متعلق پہلے ہی نوٹس دے دیا گیا ہے کہ قیامت سے پہلے اس کے حاصل ہونے کی اُمید ہی نہ رکھو۔

یہ کیفیات ہیں جو پہلے روزے کا ارادہ کرتے ہی انسان کے نفس میں ابھرنی شروع ہوتی ہیں جب وہ عملاً روزہ رکھتا ہے تو یہ بالفعل ایک طاقت بن جاتی ہیں۔ جب تیس دن تک مسلسل وہ اسی فعل کی تکرار کرتا ہے تو یہ طاقت راسخ ہوتی چلی جاتی ہے اور بالغ ہونے کے بعد سے مرتے دم تک تمام عمر ایسے ہی تیس تیس روزے ہر سال رکھنے سے وہ آدمی کی جبلت میں پیوست ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے نہیں ہے کہ یہ صفات صرف روزے ہی رکھنے میں اور صرف رمضان ہی کے مہینے میں کام آئیں۔ بلکہ اس لیے ہے کہ انہی اجزاء سے انسان کی سیرت کا خمیر بنے۔ وہ خود سے یکسر خالی ہو اور اس کی ساری زندگی تقویٰ کے راستے پڑ جائے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس مقصد کے لیے روزے سے بہتر کوئی طریقِ تربیت ممکن ہے؟ کیا اس کے بجائے اسلامی طرز کی سیرت بنانے کے لیے کوئی دوسرا کورس تجویز کیا جا سکتا ہے؟

ضبطِ نفس اس تربیت کے ضابطہ میں سے کے لیے صرف دو خواہشوں کو منتخب کیا گیا ہے یعنی شہوتِ شکم اور شہوتِ فرج۔ اور ان کے ساتھ ایک تیسری خواہش — آرام لینے کی خواہش بھی زد میں آ گئی ہے کیونکہ تراویح کے قیام اور سحری کے لیے آخر شب میں مزے کی نیند توڑ کر اٹھنے کی وجہ سے اس پر بھی اچھی خاصی ضرب پڑتی ہے۔

حیوانی زندگی کے مطالبات میں یہ تین مطالبے اصل و بنیاد کا حکم رکھتے ہیں:-

بقائے نفس کے لیے غذا کا مطالبہ۔

بقائے نوع کے لیے صنفِ مقابل سے اتصال کا مطالبہ

اپنی کھوئی ہوئی طاقتوں کو بحال کرنے کے لیے آرام کا مطالبہ۔

انہی تین ضرورتوں کا تقاضا تمام حیوانی خواہشات کا مبدا اور تمام حیوانی اعمال کا محرک ہے اور یہ تقاضا اتنا طاقتور ہے کہ حیوان جو کچھ کرتا ہے اسی کے زور سے مجبور ہو کر کرتا ہے۔

انسان کو خدمت گار اور آلۂ کار کی حیثیت سے جو بہترین ساخت کا حیوان (جسم) دیا گیا ہے، اس کے بنیادی مطالبات بھی یہی تین ہیں۔ اور چونکہ وہ تمام حیوانات سے اونچی قسم کا حیوان ہے، اس کے مطالبات بھی ان سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ وہ صرف زندہ رہنے کے لیے غذا ہی نہیں مانگتا بلکہ اچھی غذا مانگتا ہے۔ طرح

طرح کی مزیدار غذائیں مانگتا ہے۔ غذائی مواد کی ترکیبوں کا مطالبہ کرتا ہے اور اس کے اس مطالبہ میں سے اتنی شاخیں نکلتی چلی جاتی ہیں کہ اسے پورا کرنے کے لیے ایک دُنیا کی دُنیا درکار ہوتی ہے۔ وہ صرف بقائے نوع کے لیے صنفِ مقابل سے اتصال ہی کا مطالبہ نہیں کرتا، بلکہ اس مطالبہ میں ہزار نزاکتیں اور ہزار باریکیاں پیدا کرتا ہے۔ تنوع چاہتا ہے، حُسن چاہتا ہے، آرائش کے بے شمار سامان چاہتا ہے، طرب انگیز سماں اور لذت انگیز ماحول چاہتا ہے، غرض اس سلسلہ میں بھی اس کے مطالبات اتنی شاخیں نکالتے ہیں کہ کہیں جا کر ان کا سلسلہ رُکتا ہی نہیں۔ اسی طرح اس کی آرام طلبی بھی عام حیوانات کے مثل صرف کھوئی ہوئی قوتوں کو بحال کرنے کی حد تک نہیں رہتی، بلکہ وہ بھی بے شمار شاخیں نکالتی ہے جن کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ وہ صرف کھوئی ہوئی طاقتوں کو بحال ہی نہیں کرنا چاہتا بلکہ چاہتا ہے کہ حتی الامکان قوتیں کھونے کی نوبت ہی نہ آنے پائے، مشقت سے جی چراتا ہے، محنت کے بغیر کام نکالنے کی کوشش کرتا ہے، طرح طرح کی تدبیریں اس غرض کے لیے نکالتا ہے کہ بلا محنت یا کم سے کم محنت سے مقصد برآری ہو جائے، اور خصوصاً ایسے مقاصد کے لیے محنت کرنے میں تو اس کی جان پر بنتی ہے جو اس کے حیوانی مقاصد سے بالاتر ہوں۔

اس طرح ان تین ابتدائی خواہشوں سے خواہشات کا ایک

لامتناہی جال بن جاتا ہے جو انسان کی پوری زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے لینا چاہتا ہے۔ پس در اصل انسان کے اس خادم، اس منہ زور حیوان کے پاس یہی تین ہتھیار وہ سب سے بڑے ہتھیار ہیں جن کی طاقت سے وہ انسان کا خادم بننے کے بجائے خود انسان کو اپنا خادم بنانے کی کوشش کرتا ہے اور ہمیشہ زور لگاتا رہتا ہے کہ اس کے اور انسان کے تعلق کی نوعیت صحیح فطری نوعیت کے برعکس ہو جائے یعنی بجائے اسکے کہ انسان اس پر سوار ہو، اُلٹا وہ انسان پر سوار ہو کر اسے اپنی خواہشات کے مطابق کھینچے کھینچے پھرے۔ اگر انسان پوری قوت سے اس پر اپنا اقتدار مسلط نہ کرے اور تمیز و ارادہ کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دے تو بالآخر وہ اس پر غالب آ جاتا ہے۔ پھر وہ اپنے خدمت گار کا غلام اور اس کا خدمتگار اس کا آقا ہوتا ہے۔ علم اسماء کی جو نعمت اللہ نے اس کو دی ہے فکر و استدلال اور تسخیر و ایجاد کی جو قابلیتیں اسے عطا کی ہیں وہ سب کی سب اس منہ زور جاہل، نادان جانور کی خدمت میں لگ جاتی ہیں۔ بلندیوں پر اڑنے کے بجائے پستیوں پر اترنے کے کام آتی ہیں۔ اعلیٰ درجہ کے انسانی مقاصد کی جگہ ذلیل حیوانی مقاصد حاصل کرنے کا آلہ بن جاتی ہیں، ان کا کوئی مصرف اس کے سوا باقی نہیں رہتا کہ رات دن بس اسی حیوان کی خواہشات پوری کرنے کے لئے نئے نئے وسائل تلاش کرتی رہیں۔ اس کا نتیجہ

یہ ہوتا ہے کہ یہ حیوان شرالدواب — تمام حیوانات سے بدتر قسم کا حیوان —— بن کر رہ جاتا ہے۔ بھلا جس حیوان کو اپنی خواہشات پوری کرنے کے لیے انسان جیسا خادم مل جائے اس کے شر کی بھی کوئی حد ہو سکتی ہے! جس بیل کی بھوک کو بحری بیڑا بنانے کی قابلیت میسر آ جائے، زمین کی کس چراگاہ میں اتنا بل بوتا ہوتا ہے کہ اس کے معاشی مفاد کی پلیٹ میں آ جانے سے بچ جائے؟ جس کتے کی حرص کو ٹینک اور ہوائی جہاز بنانے کی قوت مل جائے، کس بوٹی اور کس ہڈی کا یارا ہے کہ اس کی کچلیوں کی گرفت میں آنے سے انکار کر دے؟ جس بھیڑیے کو اپنے جنگل کے بھیڑیوں کی قومیت بنانے کا سلیقہ ہو اور جو پریس اور پروپیگنڈے سے لے کر لمبی مار کی توپوں تک سے کام لے سکتا ہو، زمین میں کہاں اتنی گنجائش ہے کہ اس کے لیے کافی شکار (Lebensraum) فراہم کر سکے؟ جس بکرے کی شہوت ناول، ڈراما، تصویر، موسیقی، رقص، ایکٹنگ اور حسن افزائی کے وسائل ایجاد کر سکتی ہو جس میں بکریوں کی تربیت کے لیے کالج، کلب اور نغمستان تک پیدا کرنے کی لیاقت ہو، اس کی دادِ عیش کے لیے کون حد و انتہا مقرر کرنے کا ذمہ لے سکتا ہے؟

ان پستیوں میں گرنے سے انسان کو بچانے کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ اس کے سامنے انسانی زندگی کا نصب العین پیش کیا جائے، اور اسے انسانی قوتوں کا صحیح مصرف بتایا جائے، بلکہ اس

کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس حیوان کے ساتھ اس کے تعلق
کی جو فطری نوعیت ہے اس کو عملاً قائم کیا جائے اور مشق و تمرین
کے ذریعہ سے سوار کو اتنا چست کر دیا جائے کہ وہ اپنی سواری
پر جم کر بیٹھے، اور ارادے کی باگیں مضبوطی کے ساتھ تھامے،
اور اس پر اتنا قابو یافتہ ہو کہ اس کی خواہشات کے پیچھے خود نہ
چلے بلکہ اپنے ارادے کے مطابق اسے سیدھا سیدھا چلائے۔ اس
حیوان کو خدا نے اس لیے ہمارے سپرد کیا ہے کہ ہم اس سے کام
لیں اور اس کو اپنی زندگی کے مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ بنائیں۔ اس
کا دماغ ہمارے لیے فکر کرنے کا وسیلہ ہے، اس کے آلاتِ حواس
ہمارے لیے علم حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں
ہمارے لیے سعی و عمل کرنے کے آلات ہیں۔ جتنی چیزیں خدا نے
اس دنیا میں ہمارے لیے مسخر کی ہیں ان میں سب سے زیادہ
کارآمد چیز یہی حیوانی جسم ہے۔ اس کے اندر جتنی فطری خواہشات
ہیں وہ سب اس کی حقیقی ضرورتوں سے تعلق رکھتی ہیں، جن
کو پورا کرنا ہمارا فرض ہے۔ ہم پر اس کا حق ہے کہ اسے آرام سے
رکھیں۔ اس کو قوت بخش غذا دیں، بقائے نوع کے لیے اس
کی طلب کو پورا کریں، اور اسے خواہ مخواہ ضائع نہ کر دیں۔ لیکن
بہرحال یہ ہماری اور ہمارے مقصدِ زندگی کی خدمت کے لیے ہے
نہ کہ ہم اس کی اور اس کے مقصدِ زندگی کی خدمت کے لیے اس

کو ہمارے ارادے کا تابع ہونا چاہیئے، نہ کہ ہمیں اس کی خواہشات کا تابع۔ اس کا یہ مرتبہ نہیں ہے کہ ایک فرماں روا کی طرح اپنی خواہشات ہم سے پوری کرائے بلکہ اس کا صحیح مرتبہ یہ ہے کہ ایک غلام کی طرح ہمارے سامنے اپنی خواہشات پیش کرے اور یہ ہماری تمیز اور تربیت یافتہ خودی کا کام ہے کہ اس کی جس درخواست کو جب اور جس طرح مناسب سمجھیں، پورا کریں یا رد کر دیں۔

روزے کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد انسان کو اس کے حیوانی جسم پر یہی اقتدار بخشنا ہے۔ جو تین خواہشیں تمام حیوانی خواہشات کا مبداء ہیں، جو تین ہتھیار اس حیوان کے پاس ایسے طاقتور ہیں کہ ان کے زور سے یہ ہمیں اپنا مطیع بنانے کے لیے اُٹھتا ہے، روزہ انہی تینوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور اس کے منہ میں مضبوط لگام دے کر اس کی راسیں ہماری اس خودی کے ہاتھ میں دے دیتا ہے جو خُدا پر ایمان لائی ہے اور اس کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کا عزم کر چکی ہے۔ اس وقت اس جانور کی بے بسی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ صبح سے شام تک یہ دانا پانی مانگتا رہتا ہے اور ہم اس کو کچھ نہیں دیتے۔ یہ پانی کی طرف لپکنا چاہتا ہے مگر ہم باگیں کھینچ لیتے ہیں۔ یہ کھانا دیکھکر اس پر منہ مارنا چاہتا ہے مگر ہم اسے جنبش نہیں کرنے دیتے۔ یہ کہتا ہے کہ اچھا سگریٹ، حقہ، پان کسی چیز سے تو مجھے اپنی آگ بجھا لینے دو مگر ہم اس

کی درخواست کو رد کر دیتے ہیں۔ یہ اپنے جوڑے کو دیکھ کر اس کی طرف دوڑتا ہے اور ملاعبت شروع کر دیتا ہے۔ مگر جہاں تسکین نفس کا سوال بیچ میں آیا اور ہم نے لگام کھینچ لی۔ اس طرح دن بھر اس کی خواہشوں کو ٹھکرانے کے بعد ہم اپنے مالک کے مقرر کیے ہوئے وقت پر اسے چارہ پانی دیتے ہیں۔ اب یہ تھکا ہارا چاہتا ہے کہ ذرا آرام لے مگر عشاء کی اذان سنتے ہی ہم کان پکڑ کر اسے سیدھا اٹھا کھڑا کرتے ہیں اور مسجد کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ دوسرے دنوں میں تو اُسے عشا کے وقت تھوڑا ہی قیام کرنا پڑتا تھا۔ رمضان میں معمولی نماز کے علاوہ تراویح کی غیر معمولی رکعتوں کے لیے بھی ہم اسے کھڑا رکھتے ہیں۔ اس رگید سے نکل کر یہ بےچارہ سونے کے لیے دوڑتا ہے اور چاہتا ہے کہ بس صبح کی خبر لانے۔ مگر رات کے پچھلے پہر میں جبکہ اس کا رواں رواں میٹھی نیند میں سرشار ہوتا ہے۔ ہم ایک ایسا چابک رسید کرتے ہیں کہ سارا نشہ ہرن ہو جاتا ہے۔ پھر ہم کہتے ہیں کہ ہمارے مالک کا حکم دن کے بجائے اس وقت دانہ پانی دینے کا ہے لہٰذا جو کچھ کھانا چاہتا ہے اب کھالے۔

یہ مشق ہے جو ہمیں ہر سال تیس دن تک کرائی جاتی ہے تاکہ اپنے اس خادم پر ہمیں پورا اقتدار حاصل ہو جائے۔ اس سے ہم اپنے جسم اور جسمانی قوتوں کے با اختیار حاکم بن جاتے ہیں۔ حیوانی خواہشات کی جابرانہ فرمانروائی ختم ہو جاتی ہے۔ ہم میں اتنی طاقت پیدا ہو جاتی

ہے کہ اپنی جس خواہش کو جس حد پر چاہیں روک دیں ، اور اپنی جس قوت سے جس طرح چاہیں کام لے سکیں۔ وہ شخص جسے اپنی خواہشات کا مقابلہ کرنے کی کبھی عادت ہی نہ رہی ہو، جو نفس کے ہر مطالبہ پر بے چون و چرا سر جھکا دینے کا خوگر رہا ہو، اور جس کے لیے حیوانی جبلّت کا داعیہ ایک فرمان واجب الاذعان کا حکم رکھتا ہو، دُنیا میں کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔ بڑے درجہ کے کام انجام دینے کے لیے، بہرحال آدمی کی خودی میں اتنا بل بوتا ہونا چاہیے کہ وہ نفس کی خواہشات کو اپنے قابو میں رکھ سکے اور ان قوتوں کو جو اللہ نے اس کے نفس و جسم کو ودیعت کی ہیں اپنے ارادے کے مطابق استعمال کر سکے۔ اسی لیے رمضان کے فرض روزوں کے علاوہ سال کے دوران میں کبھی کبھی نفل روزے بھی رکھنے کو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے تاکہ اس اقتدار کی گرفت مضبوط ہوتی رہے۔

لیکن بہت فرق — اصولی اور جوہری فرق — ہے اس اقتدار میں جو اسلامی روزہ انسان کی خودی کو اس کے نفس و جسم پر دیتا ہے، اور اس اقتدار میں جو غیر اسلامی طور پر نفس کشی کی مشقتوں یا قوتِ ارادی کو نشو و نما دینے کی ورزشوں سے حاصل کیا جاتا ہے، یا جو فطری طور پر بڑے آدمیوں کو خود بخود حاصل ہوتا ہے۔ یہ دوسری قسم کا اقتدار تو دراصل ایک ایسی جاہل، مطلق العنان خودی کا استبداد ہے جو اپنے سے بالاتر کسی حاکم کی مطیع، کسی ضابطہ و قانون کی پابند اور

کسی علم صحیح کی تبع نہیں ہے۔ اس کو اپنی جسمانی اور نفسانی قوتوں پر جو فرمانروائی حاصل ہوتی ہے، لازم نہیں، بلکہ ممکن نہیں کہ وہ اسے صحیح مقصد کے لیے اور صحیح طریقہ پر استعمال کرے۔ دنیا میں سنیاس، رہبانیت اور ترکِ لذّات کی بیماریاں اسی نوعیت کے اقتدار سے پیدا ہوئی ہیں۔ اسی اقتدار کی بدولت نفس اور جسم کے جائز حقوق چھینے گئے ہیں۔ اسی اقتدار کے بل پر انسان خود اپنی فطرت سے لڑتا ہے۔ اسی اقتدار کی بدولت انسان نے اپنی قابلیتوں کو تہذیب و تمدّن کے ارتقاء میں صرف کرنے کے بجائے تنزل و انحطاط کی کوششوں میں صرف کیا ہے۔ اسی اقتدار کی بدولت دنیا کے بہت سے بڑے آدمیوں نے خدا کے بندوں پر اپنی خدائی مسلط کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنی طاقتوں کو حق کے بجائے ظلم کی راہ میں استعمال کیا ہے۔ برعکس اس کے اسلامی روزہ جس خودی کو نفس و جسم پر اقتدار دیتا ہے وہ مطلق العنان خودی نہیں ہے۔ بلکہ خدا اور اس کے قانون کی اطاعت کرنے والی خودی ہے۔ وہ جاہل خودی نہیں ہے۔ ایسی خودی نہیں ہے جو آپ اپنی رہنما ہو۔ بلکہ ایسی خودی ہے جو خدا کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت، العلم، کتاب منیر کی رہنمائی میں چلنے والی ہے۔ وہ خدا کے دیئے ہوئے نفس و جسم کو اپنی ملکیت نہیں سمجھتی کہ اس پر قابو پا کر اپنی صوابدید کے مطابق جس طرح چاہے حکمرانی کرے، بلکہ وہ اسے خدا کی امانت سمجھتی ہے اور اس امانت پر خدا

کے منشا کے مطابق حکومت کرتی ہے۔ ایک مومن و متقی انسان، جس کی خودی اللہ تعالیٰ کی رضا کے آگے سپر ڈال چکی ہو، دُنیا کی کسی چیز پر بھی ظلم نہیں کر سکتا، کجا کہ خود اپنے جسم حیوانی کا حق مارے اور اپنے اس رفیق پر ظلم کرے جس کو اللہ نے مدۃ العمر کے لیے اس کا بہترین مددگار بنایا ہے۔ وہ اس کو اچھے سے اچھا کھلائے گا، اچھے سے اچھا پہنائے گا، بہتر سے بہتر مکان میں رکھے گا، زیادہ سے زیادہ آرام دے گا، اس کے ہر فطری جذبہ کی تسکین کا سامان فراہم کرے گا، نہ اس لیے کہ اس کا نفس یہ چاہتا ہے کہ ایسا کیا جائے، بلکہ اس لیے کہ خدا نے اس کا حق مقرر کیا ہے، وہ اس حق کو ادا کرنا خدا کی خوشنودی کا موجب[1] ہے۔ البتہ وہی نفس

---

[1] اسی بنا پر نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے نفس پر صدقہ کرو، پھر اپنے اہل وعیال پر، پھر دوسرے لوگوں پر۔ اپنے نفس پر صدقہ کرنا، یا اپنے اہل وعیال پر صدقہ کرنا ایک عجیب سا تخیل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا اندازِ فکر کچھ ہے ہی دنیا سے نرالا۔ یہاں جو شخص اپنی خواہشِ نفس سے کھاتا ہے وہ تو بس کھا لیتا ہے مگر جو خدا کی طرف سے مقرر کیا ہوا حق سمجھ کر اپنی حلال کمائی سے اپنے جسم کو غذا دیتا ہے اور اپنے بیوی بچوں کو کھلاتا ہے وہ دراصل ایک ثواب کا کام کرتا ہے۔ ایک ایک لقمہ پر وہ اللہ کے ہاں اجر کا مستحق ہے۔ یہی بات ہے جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن کا حال موسیٰ کی ماں جیسا

جب اچھا کھانے کے لیے حرام غذا، یا حرام کی کمائی کا تقاضا کرے گا، جب اچھے لباس، اچھی سواری، اچھے مکان کے لیے ایسی تدبیریں اختیار کرنے کا مطالبہ کرے گا جنہیں اللہ نے پسند نہیں کیا ہے، جب وہ اپنے جذباتِ شہوانی کی تسکین کے لیے ایسے دروازے کھولنا چاہے گا جنہیں اللہ نے بند کیا ہے، جب وہ اپنی آرام طلبی کے لیے ان فریضوں اور ان خدمتوں کو ادا کرنے سے جی چرائے گا جو اللہ نے اس پر عائد کئے ہیں، اور جب وہ اس جگہ اپنی خواہشات اور خود اپنی قربانی دینے سے رکنا چاہے گا، جہاں اللہ کی رضا ہے کہ اسے اور اس کی خواہشوں کو قربان کر دیا جائے، وہاں مومن کی خودی اپنے حاکمانہ اختیارات کو پوری شدت کے ساتھ استعمال کرے گی اور بجبر اس کو سرکشی و نافرمانی کے راستہ سے ہٹا کر فرماں برداری کے سیدھے راستہ پر لے جائے گی۔ اسی چیز کی مشق مومن سے رمضان میں کرائی جاتی ہے تاکہ دُنیا کی اس امتحان گاہ میں نازک مواقع جب پیش آئیں ـــــ اور وہ روز ہر وقت پیش آتے ہیں۔ تو اس کے ارادے کی باگیں اس منہ زور حیوان کو قابو میں رکھنے سے عاجز نہ آ جائیں۔

(بقیہ صفحۂ گذشتہ) ہے جنہوں نے اپنے ہی بچے کو دودھ پلایا اور اس پر اُجرت بھی پائی۔ اسی طرح مومن اپنے نفس اور اپنے بال بچوں کے حقوق ادا کرتا ہے اور اس پر وہ خدا سے اجر بھی پاتا ہے۔

انفرادی تربیت کا اجمالی نقشہ

یہاں تک جو کچھ کہا گیا ہے اس کا تعلق افراد کی تربیت سے تھا۔ اب روزے کے اجتماعی پہلو کی طرف توجہ کرنے سے پہلے ایک مجموعی نظر انفرادی تربیت کے اس پروگرام پر ڈال لیجیے۔

جیسا کہ پہلے بیان کرچکا ہوں، اسلام کا اصل مقصد صالحین کی ایسی جماعت بنانا ہے جو انسانی تمدن کو خیر و صلاح کی بنیادوں پہ تعمیر کرے۔ مگر اس غرض کے لیے وہ صرف اجتماعی اصول وضع کرنے اور ان اصولوں کی بنیاد پر ایک نظامِ تمدن بنا دینے پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ ساتھ ساتھ اپنے جماعتی نظام کے لیے افراد کو تیار کرنے کا بھی انتظام کرتا ہے تاکہ جماعت (سوسائٹی) جن افراد پر مشتمل ہو ان میں کا ایک ایک شخص اپنے خیالات، اپنی سیرت اور اپنے کردار کے لحاظ سے اس نظام کے ساتھ بیش از بیش موافقت رکھتا ہو، اور باغیانہ میلانات کے ساتھ مجبورانہ اطاعت کرنے کے بجائے اپنے نفس و روح کی پوری آمادگی، اپنے دل و دماغ کے مخلصانہ عقیدے اور اپنی سیرت کی ذاتی قوت کے ساتھ اس کی پیروی کرے۔ اس اسکیم میں روزے کے رکن سے جو کام لیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ:۔

۱۔ اس تربیت کے ذریعہ سے جماعت کے ہر فرد کو خداوند عالم کی حاکمیت کے مقابلہ میں خود مختاری سے عمداً دست بردار ہو جانے کے لیے تیار کیا جائے، تاآنکہ وہ اپنی پوری زندگی کو الٰہی قانون کے

تابع کر دے۔

۲۔ ہر فرد کے ذہن میں خدا کے عالم الغیب و الشہادہ ہونے کا اور آخرت کی باز پرس کا عقیدہ عملی مشق و تمرین کے ذریعہ سے اس طرح جاگزیں کر دیا جائے کہ وہ خود اپنی شخصی ذمہ داری کے احساس کی بنا پر، نہ کہ کسی خارجی دباؤ کی وجہ سے، قانونِ الٰہی کی خفیہ و علانیہ اطاعت کرنے لگے۔

۳۔ ہر فرد کے ذہن میں یہ روح پھونک دی جائے کہ وہ ما سوا اللہ کی بندگی و اطاعت سے اعتقاداً و عملاً منکر ہو جائے اور اس کی بندگی اللہ کے لیے اس طرح خالص ہو جائے کہ جس حکم یا جس قانون یا جس اقتدار کے لیے اس کی طرف سے کوئی سند نہ ہو، اس کی اطاعت کے لیے فرد مومن کے نفس میں کوئی آمادگی بھی نہ ہو۔

۴۔ ہر فرد کی اخلاقی تربیت اس طور پر کی جائے کہ اسے اپنی خواہشات پر عملاً پورا اقتدار حاصل ہو، وہ اپنے نفس و جسم کی تمام قوتوں پر اتنا قابو رکھتا ہو کہ اپنے عقیدے اور علم و بصیرت کے مطابق ان سے کام لے سکے۔ اس میں صبر، تحمل، جفاکشی، توکل علی اللہ اور ثابت قدمی و یکسوئی کی صفات پیدا ہو جائیں اور اس کے کیرکٹر میں اتنی قوت آجائے کہ وہ خارجی ترغیبات اور اپنے نفس کے ناجائز میلانات کا مقابلہ کر سکے۔

یہی وہ مقاصد ہیں جن کے لیے اسلام نے رمضان کے روزے

ہر اس شخص پر فرض کیے ہیں جو اسلامی جماعت کا رکن ہو۔ کوئی عاقل و بالغ فرد، خواہ وہ عورت ہو یا مرد، اس فریضہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ بیماری، سفر اور بعض دوسرے شرعی عذرات کی بنا پر کوئی شخص اس فرض کو ادا نہ کر سکتا ہو تو اس پر قضا یا فدیہ لازم ہے۔ بہر حال اسلام کے دائرے میں رہ کر کوئی انسان روزے کی فرضیت سے چھوٹتا نہیں ہے۔

اگرچہ یہ لازم نہیں کہ روزے کی تربیت سے تمام افراد کے اندر وہ خصوصیات بدرجۂ اتم پیدا ہو جائیں جو اس سے پیدا کرنی مطلوب ہیں، کیونکہ ان کی پیدائش اور تکمیل کے لیے خود تربیت لینے والے میں ذاتی استعداد بھی ضروری ہے، لیکن بجائے خود اس نظام تربیت کی فطرت میں یہ خاصہ موجود ہے کہ اس سے یہ خصوصیات انسان میں پیدا ہوں اور ان خصوصیات کو پیدا کرنے کے لیے اس سے بہتر، بلکہ اس کے سوا کوئی دوسرا نظام تربیت تجویز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی شخص صداقت پسندی کی نظر سے دیکھے تو اسے اعتراف کرنا پڑے گا کہ دنیا میں اسلام کے سوا کوئی اجتماعی نظام ایسا نہیں ہے جس نے افراد کو تیار کرنے کا اتنا وسیع و ہمہ گیر انتظام کیا ہو کہ پوری کی پوری آبادیاں اس کے دائرے میں آ کر خود بخود اخلاقی تربیت پاتی چلی جائیں۔

پھر اس کا مزید کمال یہ ہے کہ سوسائٹی کے حدود میں اگر کوئی

فرد ایسا ناقص نکل آئے کہ اس اجتماعی نظام کا جزو بن کر نہ رہ سکتا ہو، تو خود بخود الگ ممتاز ہو جاتا ہے۔ جہاں اس نے بغیر عذر شرعی کے روزہ ترک کیا اور فوراً ہی یہ بات سوسائٹی میں آشکارا ہو گئی کہ اس کے درمیان ایک منافق موجود ہے جو خدا کی حاکمیت تسلیم نہیں کرتا اور اپنی حیوانی جبلت کا بندہ بن کر رہنا چاہتا ہے۔ اس طرح علامت سے سوسائٹی کو اپنے جسم میں ایک سڑے ہوئے عضو کی موجودگی کا بروقت علم ہو جاتا ہے اور اس کو موقع مل جاتا ہے کہ اپنے آپ کو اس کے زہر سے محفوظ کرے۔ کم از کم اسلام نے اپنی حد تک منافقین کی نشان دہی کا پورا انتظام کر دیا ہے اور ہر مسلم سوسائٹی کے لیے اس بات کا موقع فراہم کر دیا ہے کہ وہ عین وقت پر ان کے وجود سے آگاہ ہو کر یا تو ان کی اصلاح کرے یا انہیں اپنے دائرے سے خارج کر دے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ کوئی بے حس نام نہاد مسلم سوسائٹی اس موقع سے فائدہ اٹھانے اور ایسے لوگوں کو نہ صرف اپنی گود میں پرورش کرے بلکہ انہیں اپنے سر پر بٹھائے اور زندہ باد کے نعرے لگائے۔

روزے کا اجتماعی پہلو

نماز کی طرح روزہ بھی بجائے خود ایک انفرادی فعل ہے۔ لیکن جس طرح نماز کے ساتھ جماعت کی شرط لگا کر اس کو انفرادی سے اجتماعی فعل میں تبدیل کر دیا گیا ہے، اسی طرح روزے کو بھی ایک ذرا سی حکیمانہ تدبیر سے

انفرادی عمل کے بجائے اجتماعی عمل بنا کر اس کے فوائد و منافع کو اتنا بڑھا دیا ہے کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ تدبیر بس اتنی سی ہے کہ روزے رکھنے کے لیے ایک خاص مہینہ مقرر کر دیا گیا۔ اگر شارع کے پیشِ نظر محض افراد کی اخلاقی تربیت ہوتی تو اس کے لیے یہ حکم دینا کافی تھا کہ ہر مسلمان سال بھر کے دوران میں کبھی تیس دن کے روزے رکھ لیا کرے۔ اس طرح وہ تمام مقاصد پورے ہو سکتے تھے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ بلکہ ضبطِ نفس کی مشق کے لیے یہ صورت زیادہ مناسب تھی۔ کیونکہ اجتماعی عمل سے روزہ رکھنے میں جو آسانی افراد کے لیے پیدا ہو جاتی ہے وہ انفرادی عمل کی صورت میں نہ ہوتی اور ہر شخص کو اپنا فرض ادا کرنے میں نسبتاً زیادہ شدت کے ساتھ اپنی قوّتِ ارادی استعمال کرنی پڑتی۔ لیکن اسلام کا قانون جس حکیم نے بنایا ہے اس کی نگاہ میں افراد کی ایسی تیاری کسی کام کی نہیں ہے جس کے نتیجہ میں ایک جماعتِ صالحہ وجود میں نہ آئے۔ اس لیے اس نے روزے کو محض ایک انفرادی عمل بنانا پسند نہیں کیا، بلکہ سال بھر میں ایک مہینہ روزے کے لیے مخصوص کر دیا تاکہ سب مسلمان بیک وقت روزہ رکھیں اور وہی نظامِ تربیت جس سے افراد تیار ہوں، ایک صالح اجتماعی نظام بنانے میں بھی مددگار ہو جائے۔

اس حکیمانہ تدبیر سے روزے کے اخلاقی و روحانی منافع ہیں

جو اضافہ ہوا ہے اس کی طرف یہاں چند مختصر اشارات کیے جاتے ہیں:

تقویٰ کی فضا

اجتماعی عمل کی اوّلین خصوصیت یہ ہے کہ اس سے ایک خاص قسم کی نفسیاتی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک شخص انفرادی طور پر کسی ذہنی کیفیت کے تحت کوئی کام کر رہا ہو اور اس کے گرد و پیش دوسرے لوگوں میں نہ وہ ذہنی کیفیت ہو اور نہ وہ اس کام میں اس کے شریک ہوں، تو وہ اپنے آپ کو اس ماحول میں بالکل اجنبی پانے گا۔ اس کی کیفیت ذہنی صرف اسی کی ذات تک محدود اور صرف اسی کی نفسی قوتوں پر منحصر رہے گی۔ اس کو نشوونما پانے کے لیے ماحول سے کوئی مدد نہ ملے گی، بلکہ ماحول کے مختلف اثرات اس کیفیت کو بڑھانے کے بجائے اُلٹا گھٹا دیں گے۔ لیکن اگر وہی کیفیت پورے ماحول پر طاری ہو، اگر تمام لوگ ایک ہی خیال اور ایک ہی ذہنیت کے ماتحت ایک ہی عمل کر رہے ہوں تو معاملہ برعکس ہوگا۔ اس وقت ایک ایسی اجتماعی فضا بن جائے گی جس میں پوری جماعت پر وہی ایک کیفیت چھائی ہوئی ہوگی اور ہر فرد کی اندرونی کیفیت ماحول کی خارجی اعانت سے غذا لے کر بے حد و حساب بڑھتی چلی جائے گی۔ ایک شخص اکیلا برہنہ ہو اور گرد و پیش سب لوگ کپڑے پہنے ہوئے ہوں تو وہ کس قدر شرمائے گا؟ بے حیائی کی کتنی بڑی مقدار اس کو برہنہ ہونے کے لیے درکار ہوگی اور پھر بھی ماحول کے مختلف اثرات سے اس

کی شدید بے حیائی بھی کس طرح بار بار شکست کھائے گی؟ لیکن جہاں ایک حمام میں سب ننگے ہوں وہاں شرم بے چاری کو پھٹکنے کا موقع بھی نہ ملے گا۔ اور ہر شخص کی بے شرمی دوسروں کی بے شرمی سے مدد پاکر افزوں در افزوں ہوتی چلی جائے گی۔ ایک ایک سپاہی کا الگ الگ جنگ کرنا اور جہاںک جنگ برداشت کرنا کس قدر مشکل ہے؟ مگر جہاں فوج کی فوج ایک ساتھ مارچ کر رہی ہو وہاں جذبات شہامت و حماست کا ایک طوفان اُمنڈ آتا ہے جس میں ہر سپاہی مستانہ وار بڑھا چلا جاتا ہے۔ نیکی ہو یا بدی، دونوں کی ترقی میں اجتماعی نفسیات کو غیر معمولی دخل حاصل ہے۔ جماعت مل کر بدی کر رہی ہو تو فحش، بے حیائی اور بدکاری کے جذبات اُبل پڑتے ہیں۔ اور جماعت مل کر نیکی کر رہی ہو تو پاکیزہ خیالات اور نیک جذبات کا سیلاب آجاتا ہے جس میں بد بھی نیک بن جاتے ہیں، خواہ تھوڑی دیر کے لیے سہی۔

اجتماعی روزے کا مہینہ قرار دے کر رمضان سے شارع نے یہی کام لیا ہے۔ جس طرح آپ دیکھتے ہیں کہ ہر غلہ اپنا موسم آنے پر خوب پھلتا پھولتا ہے اور ہر طرف کھیتوں پر چھایا ہوا نظر آتا ہے، اسی طرح رمضان کا مہینہ گویا خیر و صلاح اور تقوے و طہارت کا موسم ہے۔ جس میں بُرائیاں دبتی ہیں، نیکیاں پھیلتی ہیں، پوری پوری آبادیوں پر خوفِ خدا اور حُبِّ خیر کی روح چھا جاتی

ہے، اور ہر طرف پرہیزگاری کی کھیتی سرسبز نظر آنے لگتی ہے۔ اس زمانہ میں گناہ کرتے ہوئے آدمی کو شرم آتی ہے، ہر شخص خود گناہوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے کسی دوسرے بھائی کو گناہ کرتے دیکھ کر اسے شرم دلاتا ہے، ہر ایک کے دل میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ کچھ بھلائی کا کام کرے، کسی غریب کو کھانا کھلائے، کسی ننگے کو کپڑا پہنائے، کسی مصیبت زدہ کی مدد کرے، کہیں کوئی نیک کام کر رہا ہو تو اس میں حصہ لے، کہیں کوئی بدی ہو رہی ہو تو اسے روکے۔ اس وقت لوگوں کے دل نرم ہو جاتے ہیں، ظلم سے ہاتھ رک جاتے ہیں، برائی سے نفرت اور بھلائی سے رغبت پیدا ہو جاتی ہے، توبہ اور خشیت و انابت کی طرف طبیعتیں مائل ہوتی ہیں، نیک بہت نیک ہو جاتے ہیں اور بد کی بدی اگر نیکی میں تبدیل نہیں ہوتی تب بھی اس حساب سے اس کا اچھا خاصا تنقیہ ضرور ہو جاتا ہے۔ غرض اس زبردست حکیمانہ تدبیر سے شارع نے ایسا انتظام کر دیا ہے کہ ہر سال ایک مہینہ کے لیے پوری اسلامی آبادی کی صفائی ہوتی رہے، اس کو اوور ہال کیا جاتا رہے۔ اس کی کایا پلٹی جائے۔ اور اس میں مجموعی حیثیت سے روح اسلامی کو از سرِ نو زندہ کر دیا جائے۔ اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا دخل رمضان فتحت — جب رمضان آتا ہے تو جنت

ابواب الجنة و غلقت ابواب جهنم و سلسلت الشياطين۔

کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور شیاطین باندھ دیئے جاتے ہیں۔

اور ایک دوسری حدیث میں ہے:۔

اذا کان اول لیلة من شهر رمضان صفدت الشیٰطین و مردة الجن و غلقت ابواب النار فلم یفتح منها باب و فتحت ابواب الجنة فلم یغلق منها باب و ینادی مناد یا باغی الخیر اقبل و یا باغی الشر اقصر۔

جب رمضان کی پہلی تاریخ آتی ہے تو شیاطین اور سرکش جن باندھ دیئے جاتے ہیں۔ دوزخ کی طرف جانے کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ ان میں سے کوئی دروازہ کھلا نہیں رہتا۔ اور جنت کی طرف جانے کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں ان میں سے کوئی دروازہ بند نہیں رہتا۔ اس وقت پکارنے والا پکارتا ہے ۔ اے بھلائی کے طالب آگے بڑھ اور اے برائی کے خواہشمند ٹھیر جا۔

سکتہ کے مریض کا آخری امتحان اس طرح کیا جاتا ہے کہ اس کی ناک کے پاس آئینہ رکھتے ہیں ۔ اگر آئینہ پر کچھ دھندلاہٹ سی

پیدا ہو تو سمجھتے ہیں کہ ابھی جان باقی ہے، ورنہ اس کی زندگی کی آخری امید بھی منقطع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی کسی بستی کا تمہیں امتحان لینا ہو تو آسے رمضان کے زمانہ میں دیکھو۔ اگر اس مہینہ میں اس کے اندر کچھ تقویٰ، کچھ خوفِ خدا، کچھ نیکی کے جذبہ کا ابھار نظر آئے تو سمجھو ابھی زندہ ہے۔ اور اگر اس مہینہ میں بھی نیکی کا بازار سرد ہو، فسق و فجور کے آثار نمایاں ہوں، اور حس مردہ نظر آئے تو انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ لو۔ اس کے بعد زندگی کا کوئی سانس "مسلمان" کے لیے مقدر نہیں ہے۔[1]

---

[1] یہ تو ہے امتحان کا اسلامی معیار۔ مگر اب اس جانچ کے لیے کچھ دوسرے معیار ایجاد ہو گئے ہیں۔ مسلمانوں کی کوئی آبادی غلام ہو تو اس کا امتحان یوں لیا جاتا ہے کہ قومی مفاد (یعنی قوم کے معاشی و سیاسی مفاد) کے لیے ان میں کتنی تڑپ ہے۔ اس مفاد کی حفاظت کے لیے وہ کہاں تک مل کر چیختے ہیں اور جلسوں میں اسلام اور اسلامی قومیت کا نام کس جوش و خروش سے لیا جاتا ہے۔ اور اگر وہ آبادی آزاد ہو تو اس کی زندگی کا امتحان لینے کے لیے یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس نے ہوائی جہاز کتنے مہیا کیے، ریلیں کتنی بنائیں، مدرسے اور کارخانے کس قدر قائم کئے، اپنی عورتوں کو بیحیائی میں کہاں تک طاق کیا اور تہذیب، تمدن اور معاشرت میں یورپ سے لگا کھانے کی کہاں تک کامیاب کوشش کی۔ ان آزمائشوں میں اگر کوئی آبادی پوری اتر گئی تو کہا جاتا ہے کہ الحمدللہ اسلام زندہ ہے اور بس ہوتا ہے جادہ پیما اب کارواں ہمارا"

جماعتی احساس

اجتماعی عمل کا دوسرا اہم فائدہ یہ ہے کہ اس سے لوگوں میں فطری اور اصلی وحدت پیدا ہوتی ہے۔ نسل یا زبان یا مرز بوم یا معاشی اغراض کا اشتراک فطری قومیت پیدا نہیں کرتا۔ آدمی کا دل صرف اسی سے ملتا ہے، جو خیالات اور عمل میں اس سے ملتا ہو۔ یہ اصلی رشتہ ہے جو دو آدمیوں کو ایک دوسرے سے باندھتا ہے۔ اور جس کے ساتھ خیالات اور عمل میں اتفاق نہ ہو اس سے کبھی دل نہیں ملتا، خواہ دونوں ایک ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہوں۔ جب کوئی شخص اپنے گردوپیش کے لوگوں کو ذہنیت اور عمل میں اپنے سے مختلف پاتا ہے۔ تو صریح طور پر آپ کو ان کے درمیان اجنبی محسوس کرتا ہے۔ مگر جب بہت سے لوگ مل کر ایک ہی ذہنی کیفیت کے ساتھ ایک ہی عمل کرتے ہیں تو ان میں باہم یگانگت رفاقت، یک جہتی اور برادری کے گہرے تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں، ان کے درمیان کوئی اجنبیت باقی نہیں رہتی، قلب و روح کا اشتراک اور عمل کا اتفاق ان کو آپس میں جوڑ کر ایک کر دیتا ہے۔

خواہ نیکی ہو یا بدی، دونوں صورتوں میں اجتماعی نفسیات اسی طرح کام کرتی ہیں۔ چوروں میں چوری کا اشتراک اور

شرابیوں میں شراب نوشی کا اشتراک بھی یونہی برادری پیدا کرتا ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ بدی کے راستہ میں افراد کی نفسانیت کا دخل رہتا ہے۔ جس کا فطری میلان فرد فرد کو پھاڑ کر الگ کر دینے کی طرف ہے۔ اس لیے ایسے راستوں میں برادری کبھی بے آلائش اور مستحکم نہیں ہوتی۔ بخلاف اس کے نیکی کے راستے میں نفسانیت دبتی ہے، انسانی روح کو حقیقی تسکین ملتی ہے، اور پاک جذبات کے ساتھ آدمی اس راستہ پر چلتا ہے۔ اس لیے نیک خیالات اور نیک عمل کا اشتراک وہ بہترین رشتۂ اخوت پیدا کرتا ہے۔ جس سے زیادہ مستحکم اجتماعی رابطہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا

نماز با جماعت کی طرح رمضان کے اجتماعی روزے مسلمانوں میں اسی نوع کی برادری پیدا کرتے ہیں۔ تمام لوگوں کا مل کر ایک خدا کی رضا چاہنا، اسی کی رضا کے لیے بھوک پیاس کی تکلیف اٹھانا، اسی کے خوف سے برائیوں کو چھوڑنا اور ایک دوسرے کو برائیوں سے روکنا، اسی کی محبت میں بھلائیوں کی طرف دوڑنا اور ایک دوسرے کو بھلائی پر اکسانا، یہ چیزیں ان میں بہترین قسم کی وحدت، صحیح ترین فطری قومیت، پاکیزہ ترین اجتماعی ذہنیت، اور ایسی ہمدردی و رفاقت پیدا کرتی ہے جو ہر کھوٹ سے خالی ہے۔

امداد باہمی کی روح

اس اجتماعی عبادت کا تیسرا زبردست کام یہ ہے کہ یہ عارضی طور پر تمام لوگوں کو ایک

سطح پر لے آتی ہے۔ اگرچہ امیر امیر ہی رہتا ہے اور غریب غریب، لیکن روزہ چند گھنٹوں کے لیے امیر پر بھی وہ کیفیت طاری کر دیتا ہے، جو اس کے فاقہ کش بھائی پر گذرتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کی مصیبت حقیقی طور پر محسوس کرتا ہے، اور خدا کی رضا چاہنے کا جذبہ اُسے غریب بھائیوں کی مدد کرنے پر اکساتا ہے۔ بظاہر یہ ایک بڑی چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس کے اخلاقی و تمدّنی فوائد بے شمار ہیں۔ جس قوم کے امیروں میں غریبوں کی تکالیف کا احساس اور ان کی عملی ہمدردی کا جذبہ ہو، اور جہاں صرف اداروں ہی کو خیرات نہ دی جاتی ہو، بلکہ فرداً فرداً بھی حاجت مندوں کو تلاش کر کے مدد پہنچائی جاتی ہو وہاں نہ صرف یہ کہ قوم کے کمزور حصّے تباہ ہونے سے محفوظ رہتے ہیں؛ نہ صرف یہ کہ اجتماعی فلاح برقرار رہتی ہے۔ بلکہ غربت اور امارت میں حسد کے بجائے محبت کا، شکر گذاری اور احسان مندی کا تعلق قائم ہوتا ہے اور وہ طبقاتی جنگ کبھی رونما نہیں ہو سکتی، جو ان قوموں میں ہوتی ہے جن کے مالدار لوگ جانتے ہی نہیں کہ فقر و فاقہ کیا چیز ہوتی ہے۔ جو قحط کے زمانہ میں تعجب سے پوچھتے ہیں کہ لوگ بھوکے کیوں مر رہے ہیں۔ انہیں روٹی نہیں ملتی تو یہ کیک کیوں نہیں کھاتے؟

یہ اسلام کا دوسرا عملی رُکن ہے، جس کے ذریعہ سے اسلام اپنے افراد کو فرداً فرداً ایک خاص قسم کی اخلاقی تربیت دے کر تیار

کرتا ہے اور پھر انہیں جوڑ کر ایک خاص طرز کی جماعت بناتا ہے۔ اسلام کا آخری مقصد جس مدنیتِ صالحہ اور حکومت الٰہیہ کو وجود میں لانا ہے اس کے اجزائے ترکیبی اس طرح نماز اور روزے کے ذریعہ سے پھیل بنا کر تیار کیے جاتے ہیں۔ اس کے اہل کار، عہدہ دار اور وزراء، اس کے معلم اور پروفیسر، اس کے قاضی اور مفتی، اس کے تاجر، مزدور، کارخانہ دار اور کسان، اس کے رائے دہندے، نمائندے اور شہری، سب اس تربیت کے بعد کہیں اس قابل ہوتے ہیں کہ ان کے اجتماع سے وہ صالح، تمدنی و سیاسی نظام بن سکے جسے "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ محض اَن گھڑ افراد کو لے کر خلافت الٰہیہ قائم کرنے کے لیے دوڑ جانا ایسی خام خیالی و خام کاری ہے جس سے اللہ اور اس کا رسولؐ بَری ہیں۔

ابھی اس انفرادی اور اجتماعی تربیت کا پروگرام ختم نہیں ہوا۔ اس کے ساتھ ایک تیسرا عملی رکن زکوٰۃ بھی ہے جسے ہم آگے بیان کرینگے۔